چوراہا
انور سجاد

چوراہا

افسانے

انور سجاد

مکتبہ نئی مطبوعات لاہور

پبلشرز مکتبۂ نئی مطبوعات ۷ ۔ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مطبوعہ انارکلی پرنٹنگ پریس گنپت روڈ لاہور نمبر ۲

بار اوّل   تعداد دو ہزار

مجلد   پیپر بیک

تخیل

. . . . . But man is in question ! So when will it be a question of man himself ? Will some in the world raise his voice ?

For man is in question, in his human presence : and the eye's enlargement over the loftiest inner the Seas !

Make haste ! make haste ! testimony for man.

WINDS
(Canto III—4)
Saint-John Purse

سونے کی تلاش

اس کی نظریں سامنے گولیوں سے چھدی ہوئی بھول بھلیاں میں بھٹک رہی تھیں۔ سارے راستے سینے پر تھے۔ باقی سارے جسم پر کوئی نشان نہ تھا۔ وہ ان بھول بھلیاں میں اپنی نگاہ تلاش کرتا ہوا آہستہ آہستہ اٹھا اور گیلری کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ کی کتابیں!" روشن نے پانی کی بالٹی فرش پر رکھی اور اس میں بورئیے کا ٹکڑا پھینک دیا۔ اس نے نگاہوں سے خالی، کھوکھلی آنکھیں روشن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"دیکھو میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ مجھے ڈاکٹر نہ کہا کرو۔ ابھی میرا ایک سال رہتا ہے۔ میرا نام مسعود ہے۔" کم بخت یہاں پریوں

پہلے سال سے ڈاکٹر کہنا شروع کرتے ہیں کہ انسان اپنا نام بھی بھول جاتا ہے ___ مسعود نے سوچا۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب"

مسعود مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا پوسٹ مارٹم کی میز کی طرف بڑھا پولیس سرجن اور دوسرے لوگ پوسٹ مارٹم دیکھ کر جا چکے تھے اور اس کی نگاہیں ابھی تک سینے کی بھول بھلیاں میں ٹھوکریں کھا رہی تھیں ___ کتنا خوب صورت سینہ ہے۔ جیسے ___ جیسے کیا؟ اُس نے کھو کھلی آنکھوں سے پھر روشن کی طرف دیکھا ___ "ڈاکٹر صاحب مجھے اس باڈی کو کولڈ اسٹوریج میں پہونچانا ہے اور فرش بھی صاف کرنا ہے"

جیسے، اس کی آنکھیں خالی دیواروں کی سفیدی چاٹتی ہوئی پھر سینہ پر آگئیں اور سینہ دیواروں کی سفیدی سے سفید ہو گیا ___ جیسے مرمر کی سل ___ احکام کی تختی ___ اور یہ گولیوں کے نشان، ان غاروں کے منھ جن میں داخل ہو کر جب انسان باہر آتا ہے تو مرمر کی سل بن چکا ہوتا ہے۔ جس پر وہی عبارت لکھی ہوتی ہے اور وہی غار ہوتے ہیں۔ مسعود یہ تشبیہہ سوچ کر بہت حد تک مطمئن ہو گیا کہ اب سینے کے غار روشن ہو جائیں گے اور اس کی نگاہیں لوٹ آئیں گی۔

"چلئے صاحب" روشن نے بورئیے کا ٹکڑا بالٹی میں نچوڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا بس ایک منٹ"

"اسمگلر تھا"

"ہوں"

روشن۔ بورئیے سے فرش صاف کرنے لگا۔

میں بھی لڑکوں کے ساتھ کیوں نہیں چلا گیا۔ اس نے ہولے ہولے اسمگلر کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا — میں نے اتنے پوسٹ مارٹم دیکھے ہیں۔ لیکن آج تک میری آنکھوں نے نگاہیں نہیں کھولیں۔ شاید ان میں کوئی اسمگلر نہیں ہوگا۔ اگر کوئی آیا ہوگا تو اس دن ہماری کلاس نہیں ہوئی ہوگی۔ پولیس سرجن کی عادت تھی کہ پوسٹ مارٹم کرتے وقت موت کی وجہ پر اظہار خیال کیا کرتا تھا" اُسے کام دیل کانیز نہیں بلکہ چاقو لگا ہے"۔ "رقابت بڑا عجیب جذبہ ہے۔ ہاں جی لکھئے! دل کا زخم دو انچ گہرا اور ایک انچ لمبا — اسے مارنے والے کے دس روپے دینے تھے۔ دونوں کے درمیان کچھ تلخی، ہوئی تو وہ اس کی جان لے گیا۔ فائدہ اسی کو رہا۔ دس روپے بھی استعمال کرلئے اور آئندہ ادھار لینے سے بھی چھٹکارا ہوا۔ لکھو جی۔ سر پر کٹے پھٹے دو زخم، بھیجا باہر نکلا ہوا اور سوڈے کی بوتل کی کرچیاں — یہ اسمگلر تھا۔ اسمگلر" پولیس سرجن مسکرایا تھا۔ گولیوں کے زخموں کی تعداد اور گہرائی وغیرہ لکھوانے کے بعد

اس کے سینے اور پیٹ کی قبر کھولی تھی اور پھر روشن سے جسم سینے کے لئے کہہ کر لڑکوں کو اسمگلنگ اور ملکی معاشیات کی اہمیت سمجھا کر وہ باہر چلا گیا تھا اسمگلنگ کتنا مزیدار پیشہ ہے۔ چند منٹوں میں اتنی ڈھیر ساری رقم۔ پھر اور اسمگلنگ پھر اور پیسہ۔ انسان کتنی جلد امیر ہو جاتا ہے لیکن جب اسے اسمگلنگ اور ملکی معاشیات پر سرجن کی باتیں یاد آئیں تو وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور اس نے کٹر نیشنلسٹ بن کر بڑی متنفر آنکھیں اس کے چہرے کی طرف اٹھائیں۔ اس کا سر لکڑی کے بلاک پر پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کے لمبے لمبے سیاہ اور سفید بال نیچے لٹک رہے تھے۔ اس کی ڈاڑھی بالوں سے کچھ چھوٹی تھی، جسے روشن نے لپیٹ کر پیچھے اس کی گردن کے نیچے دبا رکھا تھا۔ اس نے گردن کے نیچے سے ڈاڑھی نکال کر اس کے زخمی سینہ پر پھیلا دی۔ یہ اسمگلر نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے سکھ ہو۔ اس نے آنکھوں سے اُسے سر سے پیر تک ٹٹولا۔ نہیں یہ سکھ نہیں ہے تو پھر کوئی ملنگ ہو گا۔ ہاں ملنگ ہی تو ہے۔ اتنا پر سکون اور نورانی چہرہ۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے سوچا کہ اُسے یہ چہرہ پہلے کیوں نورانی محسوس نہیں ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ چیزوں کی اصلیت کا پتہ ان پر غور کرنے سے چلتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی چیز کو دیر تک غور سے دیکھنے پر اس کی شکل تبدیل ہونا

شروع ہو جائے۔ مثلاً بادل، اندھیرے کمرے میں کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑے اور ٹوپی ـــــ اصلیت تو وہی رہتی ہے۔ لیکن انسان اپنے احساس کے جال میں پھنس جاتا ہے تو پھر اصلیت کیا ہوئی۔ احساس یا کہ چیزوں کی ظاہری صورت ـــــ یہ میرا خیال ہے کہ یہ سمگلر نہیں اور اس کا چہرہ نورانی ہے۔ چہرے کا نور اور سکون تو زندوں کی آنکھیں خواہ مخواہ مردوں کو دے دیتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ زندگی کے چہرے کے کرب اور تاریکی سے نجات کی یہ آخری امید ہوتی ہے۔ لیکن نہیں یہ احساس تو مجھے اُسے دیکھتے ہی ہو جانا چاہئے تھا، تو پھر اس کے چہرے پر واقعی سکون ہے اور یہ اسمگلر نہیں ہے تو کیا میرا غور و فکر ٹھیک ہے۔؟ لیکن میرا خیال مجھے دھوکا بھی تو دے سکتا ہے یہ اسمگلر ہے۔ نہیں ہے۔ ہے۔ نہیں ہے۔

"تم اسمگلر ہو؟" اس کی آخری سوچ زبان سے پھسل گئی۔

"اب بن گیا ہوں" اسمگلر نے مسکراتے ہوئے بڑی نحیف آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ بعد میں سمجھاؤں گا۔ مجھے ذرا سہارا دے کر بٹھا دو۔ میں لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں۔" وہ اپنے جسم کو دبانے لگا۔ "زیادہ سونے سے کتنی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔"

"ہوں" مسعود نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ روشن غالباً بوریا نچوڑنے

کے لئے باہر جاتے جاتے ادھ کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ مسعود مسکرا دیا۔ پھر اس نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھا۔ درختوں کو تیز ہوا جھنجھوڑ رہی تھی اور آسمان پر بڑے تاریک بادل چھا رہے تھے۔ "آج بارش ہو گی۔"

"نہیں ہو گی" اس نے بھی بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس طرح پتا ہے کہ نہیں ہو گی۔"

"جس طرح تم نے کہہ دیا کہ ہو گی۔"

مسعود نے سوچا کہ آدمی ذہین ہے۔ اسمگلنگ کے لئے جرأت کے ساتھ تھوڑی بہت ذہانت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ "تم واقعی اسمگلر ہو؟" میں نے کہا تھا کہ اب بن گیا ہوں۔"

"تو پہلے نہیں تھے؟"

"تھا تو ـــ لیکن جو پکڑا جائے وہی چور ہے۔"

"تم کیا اسمگل کرتے تھے؟"

"سونا"

"سونا!" مسعود نے حیرت سے کہا۔

"ہوں" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلتا ہوا شیشے کے سربند مرتبانوں میں جگر اور گردوں وغیرہ کے حصے دیکھنے لگا۔ "میرے جسم سے کوئی خاص چیز نکلی۔؟"

"ایک بار میں تم کتنا اسمگل کر لیتے تھے؟"

"وہ اس کی آنکھوں میں سونے کی چمک دیکھ کر مسکرایا۔" میرے سینے میں کوئی گولی دولی؟"

"نہیں اس نے اپنی آنکھوں میں سونے کی چمک کو گولیوں کی بوچھاڑ سے بچاتے ہوئے کہا۔" کتنا سونا؟" بہت اتنا کہ ایک ہی چکر میں قسمت بدل جائے"

"تو پھر تم بار بار کیوں گئے؟"

اور زیادہ ــــ اور زیادہ ــــ کرنے کی خاطر۔ مختلف چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظریں میز پر جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں پر اٹک گئیں، جو کہ دل کو صاف کرتے وقت گر گئے تھے" یہ میرا خون ہے؟"

"تمہیں صرف ایک بار ہی جانا چاہیے تھا۔"

اس نے ہنستے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا اٹھا لیا۔" یہ خون نہیں سونا ہے؟"

مسعود بھنا گیا ــــ مجھے خواہ مخواہ بناؤ نہیں۔ میں اس طرح نہیں ٹلوں گا۔ تم سونا کہاں سے لاتے تھے؟

اس نے جواب دینے کے بجائے ہتھیلی پر پڑا ہوا لوتھڑا کھڑکی میں سے ہوتی ہوئی روشنی میں جوہریوں کی طرح بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں واقعی سونے سے بڑی دلچسپی ہے۔"

"کسے نہیں ہوتی۔ بتاؤ نا یہ سونا کہاں سے لاتے تھے؟"

اس نے تو تھر از مین پر گرا دیا۔" سرحد کے پار سے"

"مجھے وہاں لے چلو۔"

اس نے بڑی تیزی سے گھوم کر نوکیلی نظروں سے اسے دیکھا، پھر نرمی سے اسے سمجھایا۔ "تم ابھی جوان ہو اور یہ کام بہت خطرناک ہے۔"

"خطرات زندگی کو حسن دیتے ہیں اور پھر میں تمہاری طرح بار بار نہیں جاؤں گا۔ صرف ایک بار ــــ چلو" مسعود نے دروازہ کی طرف جاتے ہوئے کہا "پھر سوچ لو۔"

"میں آج تک یہی سوچتا آیا ہوں۔"

"ایک دم امیر بننے کی خواہش اچھی نہیں ہوتی۔"

"لیکن فائدہ مند ضرور ہوتی ہے۔"

"ایک بار تمہیں راستہ آ گیا تو تم بار بار جاؤ گے۔"

مسعود بے قرار ہو گیا "نہیں جاؤں گا بابا۔ نہیں جاؤں گا۔ اب چلو گے بھی یا نہیں۔ سونے کے بغیر میرے بہت سے کام رکے پڑے ہیں مجھے اس لمحے کا بہت دیر سے انتظار تھا۔"

"اسی عمر میں!"

"خواہشات کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ میں نے جب سے دوسروں کو سونا پہنے دیکھا ہے، استعمال کرتے دیکھا ہے اور اس کی اہمیت کو

سمجھا ہے۔ تب سے اُسے پانے کے لئے بے قرار ہوں۔ لیکن کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا ــــــ چلو۔"

اس کے ساتھی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "اب تو رات ہو گئی ہے اور گھٹا بھی پوری طرح چھا گئی ہے۔ پھر سہی۔"

رات اور گھٹا تمہاری موجودگی میں پھر کبھی اکٹھے نہیں ہوں گے۔ یہ بہترین موقع ہے۔ ورنہ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔" وہ اتنی زور سے ہنسا کہ مسعود کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ تم ہنستے کیوں ہو؟"

اُس نے اپنی گردن کو اپنے ہاتھوں سے دبایا "یونہی تم بہت ضدی ہو۔ سونا حاصل کرنے کی خواہش بظاہر تو عام ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس سے بڑھ کر عجیب خواہش اور کوئی نہیں۔" اس نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی اپنی چادر اٹھالی اور جسم پر لپیٹتے ہوئے کہا "تم جیسا متلاشی اور جرأت مند میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ چلو میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا، جہاں سے تقسیم کار سونا لاتے ہیں۔"

اس تصوّر میں مسعود کے جسم پر عجیب سی کپکپی چھا گئی اور اس نے مستقبل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا کہ یقیناً یہ کوئی بہت بڑا اسمگلر ہو گا۔ وہ دونوں دبے پاؤں دروازے کی طرف گئے۔ روشن ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔ ایک قدم اندر، دوسرا باہر اور ہاتھ میں بوریا۔ مسعود نے

رک کر اپنے ساتھی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ بغیر کسی آہٹ کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔

درختوں میں ہوا کا شور تھا۔ چند ایک ٹوٹے ہوئے پتے اُن کے قریب سے گزر گئے۔ رات بہت تاریک تھی۔ آسمان پر رات کی سیاہی میں رنگی ہوئی گھٹائیں ہر روشنی تاریک ہوگئی تھی۔ سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ مسعود ان راستوں پر چار سال سے چل رہا تھا، اور اب اس تاریکی میں صرف اس کے حافظے کی روشنی تھی۔ مسعود نے مڑ کر کہا "کچھ نظر نہیں آرہا۔ میرا خیال ہے شاید سارے شہر میں روشنی نہیں، میرا ہاتھ پکڑ لو ــــ"

"میں اسی تاریکی کے راستے آیا تھا۔ مجھے راستہ یاد ہے۔"

مسعود نے پھر بھی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ معمول سے زیادہ سرد تھا۔ مسعود نے سوچا۔ سردی خاصی ہے اور اس کے جسم میں شاید حرارت بھی کم ہو ــــ اور وہ دونوں اناٹومی ہال والا موڑ مڑ گئے۔

"یہ اناٹومی ہال ہے۔ یہاں مردوں کی چیر پھاڑ ہوتی ہے۔" مسعود نے اُسے بتایا۔

"جسموں کی؟"

"اور کا ہے کی؟" مسعود نے سوچا کیسا بچوں جیسا سوال ہے۔ وہ ہنسا۔

"تم نے کبھی مُردوں کی باتیں سنی ہیں؟"

مسعود "تم نے کبھی سنی ہیں؟ جب سر میں سفید بال آجاتے ہیں تو انسان پھر سے بچہ بننا شروع ہو جاتا ہے۔ وہی سادگی، اور معصومیت" پاکیزگی Fantasy اور ضد" تم بچے ہو" بالکل بچے۔"

مسعود نے کہا اور وہ بالکل بچوں کی طرح ہنسا" اور تم بچے نہیں ہو جو کہ سونے کی چمک دیکھ کر متجسس ہو گئے ہو ___ میں تو چاندلوں گا۔"

میں سونے کی اہمیت جانتا ہوں مسٹر ___ میں اس کی چمک کے علاوہ اس کے وجود کو بھی اپنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قیمت صرف وجود کی پڑتی ہے۔ چمک کی نہیں۔"

"خوب" اس کی آواز میں مسکراہٹ تھی "تم کافی ذہین ہو" اور مسعود نے سوچا" میں ایک اچھا اسمگلر بن سکتا ہوں۔"

اناٹومی ہال کی نکڑ پر دیوار سے ٹیک لگائے، چوکیدار بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مسعود نے اپنے ساتھی کا ہاتھ دبایا اور بوٹ کے پنجے پر چلنے لگا۔ مگر بوٹوں کی آہٹ نہ گئی۔ ابھی للکار آئے گی "ہو ___ کون ہے؟" چوکیدار نے حقہ پیتے ہوئے سر گھما کر دیکھا اور تیز ہوا میں خشک پتے ٹھوکر کھاتے ہوئے دیوار سے ٹکرائے۔ وہ ہوا کے ساتھ ہی اس کے قریب سے گزر گئے۔ چوکیدار پھر سے حقہ پینے لگا اور مسعود مطمئن ہو گیا کہ سوال جواب میں

وقت ضائع ہونے سے بچا۔" تم بہت آہستہ آہستہ چلتے ہو۔ جلدی چلو نا!"

"تم بے صبر ہو۔ اور میں بوڑھا ہوں۔" اس کے ساتھی نے مسکرا کر کہا۔

ٹک شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مسعود رک گیا اور اس کا ساتھی بھی۔ اتنی تاریکی میں صرف ٹک شاپ کے ایک کونے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ اس کے ساتھی نے چلنے کے لئے قدم بڑھایا۔ مسعود نے کہا

"ایک منٹ ـــ آؤ دیکھیں کون ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔"

"اندر روشنی ہے۔ اس وقت!"

"سونا اس سے زیادہ روشن ہے۔"

مسعود نے سنی ان سنی کر دی اور وہ دونوں دیوار کی اوٹ میں کھڑکی کی جالی سے جھانکنے لگے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے تھے۔ درمیان میں موم بتی جل رہی تھی۔ مسعود کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی۔" مجھے پہلے ہی شک تھا۔" مسعود نے سرگوشی کی۔" میں کل رپورٹ کروں گا کہ ٹک شاپ کا ناجائز استعمال ہوتا ہے۔"

"دراصل تم چاہتے ہو کہ اس لڑکے کی جگہ تم ہوتے ـــ"

مسعود نے حیرانی سے اسے دیکھا۔" تمہیں کیسے پتہ چلا۔"

"تجربہ ـــ (موم بتی نے یہ روشنی لڑکی کے گلے میں پڑے ہوئے

سونے کے لاکٹ سے لی ہے اور لاکٹ میں اس لڑکے کی تصویر ہے۔ اور میں یہ تصویر پھاڑ دوں گا۔"

"موم بتی کو دوبارہ روشن کیے بغیر نہیں اور تم روشنی کی تلاش میں نکلے ہو۔"

مسعود کو فوراً یاد آیا کہ وہ اس وقت یہاں تک کس سفر میں پہنچا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر چلو" اس کے ساتھی نے اُسے کھڑکی سے کھینچتے ہوئے کہا اور مسعود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دونتک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔

شہر میں روشنی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تیز ہوا میں روشنی اکثر بجھ جاتی ہے اور پھر آسمان پر تاریک بادل بھی تو ہیں۔ مسعود نے سوچا کہ اگر وہ ہوسٹل سے ٹارچ اور برساتی مانگ کر لے آتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن جھک شاپ میں موم بتی جل رہی تھی اور وہ اسے جلد سے جلد بجھانا چاہتا تھا۔ کل جب میں اس موم بتی کو چھوڑوں گا تو یہ سونے کی بن جائے گی ــــ اس نے سوچا ــــ پھر میں بڑے اعتماد سے اس کے گلے میں اس موم بتی کا لاکٹ پہناؤں گا۔ میں نے آج تک اس سے بات نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ اسی طرح جالی سے جھانکا ہے۔ اس کو اسی طرح چوری کیا ہے۔ اور اس کی بھاگتی ہوئی کار سے اڑتی ہوئی دھول جائی

ہے ۔ لیکن کل ـــــ کل سے میری کار کے پیچھے اُڑتے ہوئے غبار میں سونا ہو گا ۔ اور ـــــ اور سرحد تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا ۔ مسعود نے اس سے پوچھا ۔

" جتنا چلو گے ، اتنا کم وقت لگے گا ۔"

" تم مجھے ایک ہی بار اتنا سونا دے دینا کہ مجھے بار بار نہ آنا پڑے ۔"

" جتنا اٹھا سکو گے ۔ لے لینا ۔ "

اس کے ساتھی کی رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی ۔ مسعود تھوڑی دور چلتے چلتے پھر ایک دو قدم پیچھے رہ جاتا ۔ اس نے سوچا کوئی سواری ہی لے لیتے ۔ تو بہتر ہوتا ۔ لیکن اس وقت کہاں ۔ اور اگر ہوتی بھی تو کرایہ کون ادا کرے گا ۔ کل سہی ـــــ کل سے میں پیدل نہیں پھروں گا ۔ کل سے میں پڑھائی چھوڑ کے بزنس شروع کروں گا ۔ ڈاکٹری میں کیا رکھا ہے ۔ پہلے اتنا پیسہ اور وقت صرف کرو اور بعد میں کوئی مستقبل نہیں ۔ اسے اپنے کتنے دوست یاد آئے جو ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد ڈسپنسری نہیں کھول سکے تھے ۔ اور جنہیں نوکری بھی بڑی مشکل کے بعد ملی تھی اور جنہیں نوکری نہیں ملی تھی اور جو شہر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے ۔ وہ کتے کتابوں یا مٹھائی کی دکان کھولنے کے بارے میں غور کر رہے تھے ۔

وہ کون ڈاکٹر ہیں جو اتنا بہت کما رہے ہوں گے ؟ اس کے ذہن میں کم نام

آتے ۔ لیکن ان سب کو مواقع ملے تھے ۔ دراصل ہر پیشے میں انسان کو
اگر کچھ کرنے کا موقع ملے تو ہی وہ کچھ کر سکتا ہے ــــ لیکن ڈاکٹری
باقی تمام پیشوں سے محفوظ پیشہ تو ضرور ہے ، پر آمدنی رفتہ رفتہ ہی
بڑھتی ہے ، اور میں فوراً امیر ہو جانا چاہتا ہوں ۔ اب کتنا اچھا موقع
ملا ہے ــــ سونے کی تجارت ــــ اس قسم کی تجارت ــــ اس قسم کی
تجارت کو کم ظرف ہی اسمگلنگ کا نام دیتے ہیں ۔ لیکن میرے ملک
کی معاشیات ؟ ــــ لیکن میں ؟ ــــ اس کے ڈھیلے پڑتے ہوئے قدم
پھر تیز پڑ گئے ــــ میں زیادہ ضروری ہوں ۔ جب تک میں خود اتنے
بھاری بوجھ تلے سے باہر نہیں آؤں گا اور کسی کے لئے کیا کر سکتا ہوں ۔ میرا
سینہ اس رقم تلے پس رہا ہے ، جو کہ میرا ماموں میری پڑھائی پر صرف کر رہا
ہے ۔ میرے ماموں کو مجھ میں صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ میں اس کا بھانجا
ہوں ، جس کا مستقبل بنا کر اس کے ساتھ اپنی ملیح کی شادی کر دے گا ۔ اور
اس طرح ان کے احسانات کا بدلہ کچھ دے سکے گا جو اس کی ماں نے اپنے
والدین کی وفات پر اپنے بھائی کو پال پوس کر کئے تھے ۔ مسعود کو اپنے
ماموں کی لڑکی سے کوئی دلچسپی نہ تھی ، بلکہ اسے اس طوق کی گرفت بڑی
شدت سے محسوس ہوتی تھی ۔ اُسے ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ بھی اس کے
ماموں نے ہی کیا تھا ۔ اور یہی سمجھ کر اسے پڑھا رہے تھے کہ یہ پیسہ ان

بیٹی پر ہی لگ رہا ہے۔ لڑکی بھی گھر ہی میں رہے گی۔ اور خاوند بھی اچھا مل جائے گا۔ اور اب جب سے اس کالج میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں وہ لڑکی چیونٹی کی طرح رینگتی رہتی تھی جو کہ کار پر آئی تھی، جس کے گلے میں سونے کا لاکٹ تھا، اور جس سے اس نے آج تک بات نہیں کی تھی۔ ہر روز ماموں کے پیسوں کی چار دیواری اونچی ہوتی جاتی تھی اور اس کے گلے پر ماموں کی لڑکی کی انگلیوں کا دباؤ بڑھتا جاتا تھا۔ کل یہ چار دیواری گر جائے گی اور یہ انگلیاں کٹ جائیں گی۔ مسعود نے مسکراتے ہوئے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا "سلو! ہم کب تک وہاں پہنچیں گے۔"

اس نے جواب کے لئے اس کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا مسعود نے یک لخت گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے، کٹی ہوئی فصلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹھنٹھ کھڑے تھے۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں دور دور مکانوں کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں؟ ــــ آسمان پر تو بادل تھے۔ رات بہت تاریک تھی۔ اور نہ شہر میں روشنی نہیں تھی۔ یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں کس وقت پہنچا ہوں۔ اس نے پھر سے اسی سمت دیکھا۔ جدھر وہ دونوں جا رہے تھے۔ بہت دور ایک سایہ جا رہا تھا ــــ "ٹھہرو"

اس نے چیخ کر کہا۔

اس کے ساتھی نے وہیں سے ہنستے ہوئے کہا۔ ”نہیں بہت جلدی تھی۔“

مسعود نے اپنے آپ سے اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے اُسے آہستہ سے بڑے غصے میں گالی دی۔ اس کا ساتھی رکا نہیں تھا۔ مسعود گھبرا کر اس کی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا ساتھی اسی مسلسل رفتار سے چل رہا تھا۔ سخت زمین پر کٹی ہوئی فصل کے نوکیلے خشک ڈنٹھلوں سے اس کے گھسے پھٹے بوٹ اور بھی چھد گئے تھے۔ تھوڑی دور بھاگنے کے بعد اس کے بوٹ کا تلا بالکل جواب دے گیا —— اس نے رک رک کر جلدی جلدی بوٹ اتارے اور پھر بھاگنے لگا —— خشک زمین میں اگے ہوئے کانٹوں کی نوکوں پر —— اندھا دھند —— اس کے ذہن میں صرف وہ سایہ تھا جس تک اسے پہنچنا تھا۔ ورنہ وہ اجنبی کھیتوں میں بھٹک بھٹک کر مر جائے گا۔ کیونکہ وہ اپنی جیب میں وہ دانے لے کر نہیں آیا تھا جنہیں وہ راستہ بھر بکھیرتا آتا تاکہ واپسی پر اگی ہوئی فصل دیکھ کر راستہ ڈھونڈنے میں دقت نہ ہوتی۔

”تم مجھے پیچھے کیوں چھوڑ آئے ہو“ مسعود نے اس کے پاس پہنچ کر ہانپتے ہوئے پوچھا۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس کا

ساتھی خاموش تھا۔ اور اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ بتا رہا تھا
"میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔ تم خود ہی پیچھے رہ گئے تھے۔"
"مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا، تم کب آگے نکلے ہو۔"
مختلف قسم کے خیالات رفتار کو بد ہضم کر دیتے ہیں۔ اگر تمہارے
ذہن میں صرف اپنی منزل کا خیال ہوتا تو تم کبھی پیچھے نہ رہتے۔"
"میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"
"اگر تم صرف وہاں تک پہنچنے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے
تو تمہاری رفتار بھی مجھ اتنی ہوتی۔"
مسعود کچھ حیران ہوا کہ اسے کیسے پتہ چلا کہ وہ کچھ اور بھی سوچتا رہا
ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ اس نے یہ نتیجہ منطقی طور پر اخذ کیا ہے
اور وہ ایک قدم پیچھے رہ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے ٹھہرنے کے
لئے کہا۔ وہ بغیر رکے بولا "چلے آؤ چلے آؤ۔ تمہیں ہی بہت جلدی
تھی۔ اس راستہ پر ستایا نہیں جاتا۔ ممکن ہے کوئی آ لے۔"
اس بیابان میں کون آئے گا۔ رک جاؤ۔ میرے پیروں میں شدید درد
ہو رہا ہے۔" اس کی آواز میں التجا تھی
اس کا ساتھی ہنسا۔ "تم میں خواہش ہے، جرأت ہے، لیکن قوت
برداشت نہیں ہے۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ کبھی نہ

آتا پہلے تم مصائب جھیلنے سیکھتے، پھر اس راستے پر لاتا۔ جانتے ہو۔
جب کوئی اسمگلنگ کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا
سلوک ہوتا ہے ـــــ اس کو بڑی بڑی اذیتیں دی جاتی ہیں تاکہ اس
سے اور اطلاعات مل سکیں۔ اگر وہ سختی ـــ نہ جھیل سکے اور سب
کچھ بک دے تو پھر اور اسمگلنگ کے سارے راستے مسدود ہو
ہو جاتے ہیں۔ تم تو اس راستے سے ہی گھبرا گئے ہو۔ اگر پکڑے جاؤ تو؟"
"میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مگر خدا کے لئے اس وقت ایک پل رُک
جاؤ۔ مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ مسعود وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور اس کے
ساتھی کو رکنا پڑا۔ پیر دباتے ہوئے پیروں سے بہتا ہوا خون محسوس ہوا۔
میرے پیروں سے خون بہہ رہا ہے۔"
"اسے دل سے بہنا چاہیے تھا۔ پھر یہ سونا ہوتا ـــــ سونا ـــــ"
"بعض وقت تم بڑی عجیب سی باتیں کرتے ہو۔"
"جب تم میری طرح سونا پالو گے تو تم بھی ایسی باتیں کرنے لگو گے
بے معنی سی۔" وہ ہنسا ـــ" اب چلو۔ کافی سستا لیا ہے۔ اگر صبح ہو
گئی تو کبھی سرحد نہ پار سکیں گے ـــــ پھر تم ـــــ"
"کتنی دور ہے سرحد ـــ؟" مسعود نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا
"وہ جو سامنے سفید سی لکیر ہے ـــ افق سے ذرا نیچے ـــ وہ"

"کیا ہے وہ ؟"

"دریا ہے ۔۔ چاند کی روشنی میں دریا چمک رہا تھا ۔۔۔
مسعود گھٹنے سے دوسرا پیر زمین پہ اتار کے اُٹھ کھڑا ہوا اور بغیر
کچھ کہے ہوئے لنگڑاتا ہوا چلنے لگا ۔ اس کا ساتھی بھی خاموشی سے چلنے لگا
مسعود اپنے پیروں سے بے پرواہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔۔۔ اسی
رفتار سے، مسلسل ۔۔۔ اگر صبح ہو گئی تو کیا ہو گا ۔۔۔ پھر میں کبھی
سونا نہیں لا سکوں گا ۔۔۔ پھر یہ شخص مجھے کبھی نہیں ملے گا ۔ اور میں
ماموں کے پاس اپنی گندی زندگی کو کبھی نہیں چھوڑا سکوں گا ۔ مجھے صبح
ہونے سے پہلے ہی سرحد پار کر لینی چاہیئے ۔ ورنہ میرا دم ایسی زندگی کی
قید میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو جائے گا ۔ مجھے سرحد پار کر لینی چاہیئے ۔
ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی اور دریا ابھی دور ہے اور کشاپ
میں موم بتی بھی تو ابھی جل رہی ہو گی ۔ مجھے اس موم بتی کو بجھانا ہے ۔
اس موم بتی کے سونے سے اس لڑکی کو لاکٹ بھی تو پہنانا ہے ۔۔۔ بھاگو
جلدی کرو ۔۔۔ مسعود بھاگو بھاگو ۔۔۔ اس نے مڑ کر ساتھی کو دیکھا کہ
اس سے جلدی چلنے کے لئے کہے ۔۔۔ مگر اس کا ساتھی پھر غائب تھا ۔

"کہاں چلے جاتے ہو تم"؟ اس نے روہانسا ہو کر چیخ کے کہا
بھاگو ، جلدی کرو مسعود ، اسے ذبح کرو ۔۔۔ سامنے دریا ہے ، اور ابھی صبح

ہونے ہی والی ہے۔ اگر رکو گے تو مجھے ایک ایک کر کے بہر حال پھسلتے ہی جاہیں گے۔ اگر دریا پار کر لیا تو اس کے بعد وہاں نہیں کوئی نہ کوئی پل ہی جائیگا۔ دنیا میں صرف ایک وہی تو ۔۔۔ بھاگو، مسعود ۔۔۔ ساری دنیا تمہارے ہاتھ کی ایک لمس کی منتظر ہے۔ ذرّہ ذرّہ سونا بننے کے لیئے بے قرار ہے تمہیں اس لڑکی کے گلے میں سونے کا لاکٹ پہنانا ہے ۔۔۔ جلدی کرو جلدی ۔۔۔ ورنہ یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح تمہارے ذہن پر نقش ہو جائے گا ۔۔۔ لیکن اس کے بغیر میں دریا تک کیسے پہونچوں گا مجھے تو آگے کچھ نظر نہیں آرہا۔ صرف وہ پانی کی لکیر ہے۔ اس تک کون سا راستہ جاتا ہے۔ ہر راستہ مجھے دریا کے متوازی ہی نظر آرہا ہے ۔۔۔ وہ پاگلوں کی طرح گھومنے لگا۔ اس کی کنپٹیاں بے طرح بجنے لگیں۔ اس کا رواں رواں کانپنے لگا۔ سارے مساموں سے پسینہ ابلنے لگا۔ اس کے لہولہان پیروں میں درد پھر سے لوٹ آیا تھا۔ پیر سوجنے کے باعث اس کے قدم اتنے بوجھل ہو گئے تھے کہ اس سے اٹھائے نہیں جاتے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لیئے رُکا۔

کہاں ہو تم؟ ۔۔۔ اس کی چیخ سے فضا گونج اٹھی۔ دور سے ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی۔ اس نے غور سے قہقہے کی سمت دیکھا ۔۔۔ اس کا ساتھی تھا۔ گھبراہٹ میں ہر وہ چیز نظر نہیں آتی جس کی تلاش ہوتی ہے۔ مسعود نے

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا، یہ مجھ سے آگے کیوں نکل جاتا ہے۔ تم سوچتے ہو اور سوچنے سے رفتار کم ہوتی ہے۔ ذہن میں صرف منزل کا دھیان ہونا چاہیے۔ اگر تم اسی طرح اور کچھ سوچتے رہے تو تم وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ پھر صبح ہو جائے گی ــــ اور ــــ وہ پھر اٹھ کر اپنے ساتھی کے سائے کی طرف بھاگنے لگا۔ اس کے پیر سُن ہو گئے تھے۔ اس کے پیر ٹخنوں کے ساتھ نہیں تھے۔ ذہن کو پیروں سے چھونے کا احساس بھی پیروں سے بہتے ہوئے خون کے ساتھ بہہ گیا تھا۔ جوں جوں وہ سائے کی طرف بڑھتا جاتا تھا۔ سایہ اس سے دور ہوتا جاتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف میرے مقصد کا دھیان ہونا چاہیئے۔ اگر میں نے کچھ اور سوچا ... بھاگو مسعود تمہیں صبح سے پہلے وہاں پہنچنا ہے ــــ وہ سامنے دریا ہے، وہ سامنے سایہ ہے ــــ وہ سامنے سونا ہے۔ اس کا ساتھی دریا کے کنارے بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ مسعود نے بڑے غصے سے اس سے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ مگر اس نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر اسے منع کر دیا۔ مسعود کی نظریں ــــــ اس کی نظروں کو کھینچ کر اپنے پیروں پر لے آئیں۔ پیر سوج کر اصل سے دو گنے ہو گئے تھے اور ان پر خون کی تہہ جمی تھی۔ اس کے ساتھی نے مسکرا کر اس کے کندھے تھپکاتے ہوئے سرگوشی کی۔ "شاباش کوئی بات نہیں۔ راستوں پر یوں ہو جایا کرتا ہے۔ اب تو ہم پہنچ گئے ہیں۔"

مسعود نے تھکی سے جان حاصل کر کے دریا کے کنارے کو بڑے غور سے دیکھا "کشتی وغیرہ تو ہے نہیں ہم اسے کس طرح پار کریں گے۔"
"دیکھتے رہو"۔ اس کے ساتھی نے اپنی چادر کو دوبارہ لپیٹتے ہوئے کہا ——

"عصا لگاؤ گے ؟"

"یہ نیل نہیں ہے"

"تو پھر"

"غور سے سنو۔ میں پہلے دریا میں قدم رکھوں گا۔ تم میرے پیچھے پیچھے آتے جانا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ دریا کہاں سے گہرا ہے اور کہاں سے نہیں۔ اور ہاں دریا میں پیر رکھنے کے بعد تم سوچنا بالکل بند کر دو گے۔ ورنہ تمہارا پیر کہیں ادھر ادھر پڑ گیا تو ڈوب جاؤ گے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ ذہن کبھی سوچ سے خالی بھی رہ سکتا ہے۔"
دریا پار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سوچ ختم ہو جائے۔ پھر اس نے سوچ کر کہا۔ "اچھا یوں کرو۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

مسعود نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ پہلے سے زیادہ سرد تھا۔ بالکل برف۔ مسعود نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اور اس نے جواب میں کہا — "کیا سردی کم ہے ؟"

اس کے ہاتھ کی برف مسعود کے ہاتھوں کی رگوں میں اترنے لگی۔ اس کا ساتھی دریا میں پیر رکھ چکا تھا۔ "آؤ" مسعود نے بھی پیر دریا میں ڈال دیا۔ اس کی رگوں میں اترتی ہوئی برف اس کے دماغ تک پہنچ گئی۔ اس کا دماغ بالکل سن ہوگیا اور وہ اتنا ہلکا ہوگیا جیسے اس کا کوئی بوجھ ہی نہیں تھا۔ اس کے قدم دھند میں پڑ رہے تھے۔ وہ بادلوں میں بادل بن گیا۔ وہ ہواؤں میں ہوا ہوگیا۔ اس کا ذہن، ذہن نہیں رہا تھا۔ ورنہ ضرور کچھ سوچتا، وہ کچھ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ تھا ــــ مگر کیا تھا۔ اندھیروں میں اندھیرا، روشنیوں میں روشنی یا خلاؤں میں خلا، یا خلاؤں میں وجود یا میں کون ہوں؟ ــــ "میں کیا ہوں؟ مجھے کیا ہوگیا ہے؟" ــــ اس نے اپنے ساتھی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے پوچھا اور اس کا پیر دریا میں کسی گڑھے میں پڑتا پڑتا بچا۔ اس کے ساتھی نے اسے کھینچ لیا اور وہ دوسرے کنارے پر تھے۔

"ابھی گرنے لگے تھے۔ دیکھ لیا پھر سوچ کا نتیجہ! شکر کرو میں کنارے پر تھا۔ ورنہ اسمگلنگ وغیرہ سب رہ جاتی۔"

مسعود نے مڑ کر دیکھا۔ دریا اسی طرح بہہ رہا تھا۔ اسے جھرجھری آگئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ افق پہ کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر ساتھی سے کہا "سورج نکل رہا ہے۔" "اب؟"

اس کے ساتھی نے روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہیں یہ

سورج نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے۔"؟

"روشنی ہے۔"

"کاہے کی۔؟"

"تم سونا لینے آئے ہو، اپنے کام سے غرض رکھو۔ اس کے ساتھی نے پہلی مرتبہ اُسے ڈانٹا۔ مسعود نے اس سلسلہ میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا کہ کہیں یہ ناراض ہو گیا تو کیا ہوگا۔ "اب ہمیں کتنی دور جانا ہے؟"

"نزدیک ہی ہے۔ آؤ۔"

وہ دونوں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گزرنے لگے۔ مسعود بار بار مڑ کے اس روشنی کو دیکھتا جاتا تھا جو سورج کی نہیں تھی۔ "یہ کس چیز کی روشنی ہے۔ مسعود نے بار بار اپنے دل میں سوال کیا۔ ایسی روشنی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ چاند، سورج، آگ، بجلی۔ ان سب کی روشنیوں کا مجموعہ ــــ پھر بھی، ان سے الگ تھلگ۔ یہ روشنی کہاں پر ہے؟ اس روشنی کا منبع کیا ہے؟ اس کے ساتھی نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے روشنی سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ایک کمرے میں کھڑا تھا۔

"اٹھا لو ــــ جتنا سونا اٹھا سکتے ہو۔"

"سونا کہاں ہے؟"

"تمہارے سامنے سونا ہی سونا ہے۔ لاتعداد سونے کی اینٹیں پڑی ہیں۔"

"مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ــــ میری آنکھوں میں وہ روشنی ہے۔" مسعود نے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"تھوڑی دیر آنکھیں بند کر لو"

"میں آنکھ نہیں جھپک سکتا۔"

"یہ تو سانپ کی خاصیت ہے۔"

"میں سانپ نہیں ہوں ــــ مجھے اتنا بتا دو یہ روشنی کس چیز کی ہے"! اس نے پھر دروازے سے باہر روشنی کو دیکھا ــــ یہ روشنی سب روشنیوں کا مجموعہ ہے۔ پھر بھی ان سے الگ تھلگ ــــ اس کے ساتھی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا ــــ اب مسعود کے سامنے سونے کی اینٹیں ہی اینٹیں تھیں ــــ "اب تو تمہیں سونا نظر آرہا ہے سونا ــــ"

"اب جب کہ میں یہاں آگیا ہوں۔ مجھے یہ روشنی بھی دیکھنے دو۔"

"تم سونا اٹھاؤ اور چلو۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے رہ رہ کر اس روشنی کا خیال آرہا ہے گا۔ دیکھو یہاں تک پہنچتے پہنچتے لہولہان ہو گیا ہوں۔ مجھے اتنا ہی بتا دو یہ

روشنی کس چیز کی ہے۔ مسعود نے بہت الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھی نے کچھ وقفہ کے بعد کہا۔ "یہ تم خود پہچانو۔"

"سونا — ! اتنا عجیب و غریب"

"ہاں سونا ہی کہہ لو"

"کس قسم کا سونا ہے، جس کی ایسی روشنی ہے۔"

"جس نے بھی آج تک یہ سونا دیکھا ہے، اُسے بیان نہیں کر سکا۔"

"کیوں —— ؟"

"کیونکہ اسے کسی چیز سے بھی تشبیہ نہیں دی جا سکتی، مختلف لوگوں نے اس کی مختلف شکلیں بنائی ہیں۔ لیکن اصل —۔"

"تو وہ تھوڑا سا یہ سونا ہی لے آتے۔ اس کا ایک تولہ اس سونے کے ایک ٹن کے برابر ہو گا — اتنا عجیب کہ کوئی بیان بھی نہ کر سکے۔

"ہوں — لیکن اسے لانے کے لیے بڑی کڑی شرطیں ہیں — تم چھوڑو اسے — جتنی اینٹیں اٹھا سکتے ہو۔ اٹھا لو۔"

"مجھے وہاں لے چلو —— ورنہ میں واپس نہیں جاؤں گا۔"

مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم ضرور ضد کرو گے۔ اس راستے سے جو بھی آتا ہے، اسی سونے کی خواہش کرتا ہے۔ انہیں دوسرے راستے سے لاتا تو بہتر ہوتا۔"

پھر اس نے مسعود کو سمجھایا۔ ''دیکھو تمہیں جو کچھ چاہیئے یہیں سے لے جاؤ۔''

مسعود نے سوچا ایک بار میں یہ سونا اتنا نہیں لے جایا جا سکتا مجھے ایک بار دوبارہ آنا پڑے گا۔ اس سونے کا ایک تولہ ہی کافی ہے۔ اگر ٹھیکریاں ہیں تو کیا ہوا۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے انسان نہ کر سکے۔ جن کا ذکر یہ کر رہا ہے۔ آخر وہ لوگ بھی تو وہاں تک پہنچے ہی ہوں گے۔ میں یہاں تک آگیا ہوں تو وہاں تک کیوں نہیں جا سکتا — اس کے ساتھی نے دونوں ہاتھوں میں سونے کی اینٹیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھائیں۔ ''یہ لو!'' یہ تو مٹی ہے — اسے جب تک وہاں سے خود نہیں اٹھاؤں گا۔ یہ سونا نہیں بنے گی — لیکن میں اسے چھوؤں گا بھی نہیں — مجھے وہاں لے جاؤ۔ اس نے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھر التجا کی۔ ''میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔'' ''بڑے ضدی ہو'' اس نے اینٹیں واپس انبار پر پھینک دیں — ''یہ ضد نہیں، خواہش ہے — لگن ہے۔''

اس نے سامنے والی دوسری دیوار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''اب تم نے اس لگن کی خاطر اپنے آپ کو اتنا زخمی کیا ہی ہے، تو چلو تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی ملا تھا — لیکن تم اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچ چکے کہ تمہیں اس سونے تک پہنچنا ہے — ورنہ میں پھر آگے نکل جاؤں گا۔ اور اب

تم میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ بھاگ کر مجھ تک آ سکو۔

"تم فکر نہ کرو،" مسعود نے بے صبری سے کہا۔

"اور ہاں ـــــ راستے میں بڑی بڑی مصیبتیں آئیں گی ـــــ لیکن نہیں، اب مجھے تمہاری قوت برداشت پر اعتماد ہو گیا ہے۔ آؤ،" اس کے ساتھی نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کے سامنے تھوڑی دور ہٹ کر مرمر کی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کی شکل مرمر کی بہت بڑی سِل ایسی تھی۔ اس کے ساتھی نے پہاڑی کے ایک حصّہ کے ساتھ پڑی ہوئی مرمر کی سِل اٹھائی۔ سامنے ایک بہت بڑے غار کا منہ تھا۔ جانے مسعود نے کیا سوچ کر اس سے پوچھا۔ "اس سِل کی شکل سینے ایسی کیوں ہے؟"

دیکھا میں نہ کہتا تھا۔ اب تم نے مجھ سے ایسے سوال شروع کر دیئے ہیں۔ غار کے اندر جانے سے پہلے ایک وعدہ کرو کہ تم اب مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔ ورنہ میں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گا۔"

"اچھا" ـــــ اور مسعود کے ذہن میں فوراً ایک اور سوال آیا۔ کہ اس سینے پر بندوق کی گولی سے بنا غار کا منہ کیوں ہے؟' اس نے اس سوال کو دماغ ہی میں دبا دیا۔ غار کے اندر اس کے پیچھے داخل ہوتے ہی اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ تاریکی میں گرتا ہی چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد جب اس کے پیر زمین پر لگے تو اندھیرا غار روشن ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے صحرا میں پایا۔ صحرا کی روشنی عین سامنے سے آ رہی

تھی اور اس سونے کی روشنی سے ملتی جلتی تھی۔ غرض صرف اتنا تھا کہ اب
تیزی ذرا زیادہ تھی ـــــ اب ہم عنقریب اس تک پہنچ جائیں گے۔
مسعود نے سوچا ـــــ اس کا ساتھی اس روشنی کی سمت میں اس کے
آگے چل رہا تھا۔ وہ صحرا میں کتنا ہی عرصہ چلتے رہے۔ اس کے پہلے ہی سے
زخمی پیروں میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے آبلے مل کر اتنے بڑے ہو
گئے تھے کہ پیر بھی ایک بہت بڑا آبلہ بن گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے
پیچھے چلتا جا رہا تھا۔ اس نے ساتھی کو رکنے کے لئے ایک دو آوازیں بھی
دیں تھیں۔ لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔ پیاس سے اس کے حلق میں
پڑنے ہوئے کانٹوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا، دور دور تک پانی کا نشان
نہیں تھا۔ اس نے ایک آبلے پہ چلتے چلتے دوسرے کو نوچ کر آبلے کا پانی
پینا چاہا۔ لیکن پانی ہاتھ میں بہہ کر ریت میں جذب ہو گیا۔ اسے ریت میں چمکیلے
ذرّے نظر آئے ـــــ سونا! ـــــ اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے روشنی
کی طرف دیکھا۔ منزل دور نہیں تھی ـــــ یہ سونا ان شعاعوں سے گرا ہوگا۔
تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کو پھر پیاس نے تنگ کیا۔ تو اس نے دوسرے
پیر کو بھی نوچا۔ پانی پھر ریت میں جذب ہو گیا اور سونا! اس نے نظریں
اٹھائیں۔ روشنی کے عین نیچے چمکتا ہوا پانی نظر آ رہا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں
پہ زبان پھیرتا ہوا بڑی تیزی سے پانی کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ یہ بھی بھول گیا
کہ اس کے پیر پھوٹ بہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی سے اپنے ساتھی کے قریب سے
گزر گیا۔ جوں جوں وہ پانی کی طرف بڑھتا جاتا تھا۔ پانی کی لکیر سمٹ کر اکٹھی

ہوتی جاتی تھی۔ جب وہ میدان تک پہنچا تو وہاں پانی تھا نہ پانی کا نشان۔ بلکہ وہ چمکیلی پہاڑیوں میں گھرا کھڑا تھا۔ ان پہاڑیوں میں ان گنت غار تھے اور ہر غار کے منہ سے اسی سونے کی روشنی پھوٹ رہی تھی اور تیز اور چمکیلی ——

وہ ایک غار کے سامنے بیٹھ کر سستانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ساتھی بھی پہنچ گیا۔ "تم نے بہت جلدی کی۔"

"مجھے پیاس لگی ہے"

"پیاس کو مار دو"

"مجھے بھوک لگی ہے"

"اسے بھی مار دو" —— اٹھو! —— ہمیں سونے تک پہنچنا ہے۔"

مسعود نے بڑی مشکل سے اٹھتے ہوئے نگاہوں سے پوچھا "کس غار میں —— ؟"

"سبھی سونے تک جاتی ہیں۔" کسی ایک میں چلو۔

وہ دونوں ساتھ والے غار میں داخل ہو گئے۔ اندر بے حد روشنی تھی۔ مسعود کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب اس نے پوری توجہ سے غور کیا تو اس نے دیکھا کہ یہ روشنی برگد کے پتوں سے آ رہی ہے۔ صرف گیارہ پتوں سے۔ باقی سارے سبز تھے۔ یہ روشنی کچھ اس قسم کی تھی جو اس نے دریا پار کرنے سے لے کر صحرا تک دیکھی تھی —— لیکن اب یہ بہت تیز تھی —— بہت ہی تیز —— یہ سارے پتے سونے کے کیوں نہیں ہیں —— صرف گیارہ پتوں سے روشنی کیوں آ رہی ہے —— اور درخت کا تنا بھی عام درختوں ایسا ہے —— سوچتے

ہوئے جب اس کی آنکھیں اس روشنی سے کچھ کچھ مانوس ہو گئیں تو اس نے محسوس کیا کہ اس درخت کے نیچے کوئی بیٹھا ہے اور اس کا جسم بالکل دھندلا دھندلا سا ہے ———

"یہ کون ہے؟"

"تم نے پھر سوال کیا۔"

"صرف اس کا جواب دے دو۔ اگر کوئی اور سوال کیا تو بے شک میرا ساتھ چھوڑ دینا۔"

"اب تمہارا ساتھ تو میں کیا ہی چھوڑوں گا ——— یہ بھی اسمگلر ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسمگلر؟ ——— مسعود کو یقین نہ آیا۔

"جیسے میں اور تم"

"میں، میں ہوں، اور تم تم ہو۔ ——— مگر یہ کون ہے؟"

"یہ ہم دونوں ہیں"

"ہم دونوں کا نام کیا ہے؟"

"اسمگلر"

مسعود نے اس تجربے پر غور کیا، تو درخت کے نیچے وہ خود آمنے سامنے بیٹھا تھا۔ "چلو" اس کے ساتھی نے کہا۔

"میرے پیر نہیں ہیں۔ مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔"

تمہیں اٹھنا پڑے گا۔

"میرے جسم میں جان نہیں ہے۔ مجھ سے ہلا بھی نہیں جاتا۔"

"تمہیں چلنا پڑے گا"

"لیکن ہم سونے تک کب پہنچیں گے، مجھے سونا چاہیئے، سونا کہاں ہے۔؟"

"بس ۔۔۔ ذرا آگے"

"مسعود گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔" یہ اور اسی قسم کے دوسرے غاروں میں سب لوگ سونا لینے آئے تھے۔ لیکن ۔۔۔" مسعود کی زبان دانتوں تلے آگئی۔ اس کے کان بند ہو گئے۔ اور اس کی آنکھوں میں بہت بڑی قندیل تھی۔ اور اس قندیل میں وہ سونا تھا اور اس سونے سے لاتعداد رنگوں کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ہر شعاع کے ان گنت رنگ تھے اور پھر ان لاتعداد رنگوں کے ان گنت رنگ۔ ان رنگوں کا ایک ایک قطرہ چاند، سورج، آگ اور بجلی کے حلق میں ٹپک رہا تھا ۔۔۔ کوئی تو ستر ہزار سال کے بعد یہاں تک پہنچتا ہے اور کوئی اتنی جلد ۔۔۔ مسعود نے سوچا ۔۔۔ اور ہاتھ بڑھا کر بڑی بے صبری سے سونے کی طرف بڑھا۔

اس کے ساتھی نے اسے کندھے سے تھام لیا۔

کیوں؟ ۔۔۔ مسعود نے مڑ کر اس سے پوچھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کو اسمگل کرنے کے لیئے بڑی شرطیں ہیں

"کیا ہیں؟ ۔۔۔ میں انہیں پورا کروں گا"

"تمہیں اپنی زبان اور دونوں ہاتھ کٹوانے پڑیں گے۔"

" لیکن بڑے کے پتنے سونے کے ہیں، اور اس کے نیچے ـــ "

" وہ سونا نہیں چمک ہے ـــ وہ اور دوسرے غاروں کے سب ہی باسی اس شرط کو سن کر صرف چمک لے کر لوٹ گئے تھے ـ اور یہ سونا ہے "

" لیکن یہ شرط کیوں ہے " ـــ ؟

" زبان کا کام ہے بولنا اور ہاتھوں کا کام ہے لینا دینا ـ "

" میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سونا کسی کو نہیں دوں گا اور کسی کو اس بارے میں جتاؤں گا بھی نہیں ـ "

" تو پھر اس کو لے جانے کا فائدہ ہی کیا ہے ـــ میں تم کو اسی لئے یہاں لانا نہیں چاہتا تھا کہ تم سونا تو نہیں لے جا سکتے اور اس کی صحیح تفصیلات لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر سکتے ـ زبان تو بولے گی ہی ـ "

مسعود کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اتنی مصیبتیں جھیل کر یہاں پہنچنے کے بعد کس طرح خالی ہاتھ لوٹ سکتا ہے ـــ " تو پھر ـــ ؟ "

" تم ذرا آرام کر لو پھر چلیں گے ـ "

" اگر میں سونا لے کر بھاگ جاؤں تو ـــ ؟ مسعود نے بیٹھتے ہوئے کہا ـــ

اس کا ساتھی ہنسا تو سرحد پہ مارے جاؤ گے ـ " ـــ اس نے سینہ سے چادر ہٹائی ـ اس پر گولیوں کے نشان تھے ـــ مسعود نے سوچا اسمگلنگ میں ہر طرح کے خطرات پیش آتے ہیں ـ اور اگر اس کو گولیاں لگ گئی ہیں تو ضروری نہیں کہ میں بھی نشانہ بنوں ـ اس سے ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہوگی ـ

اور پھر خطرے کے بغیر زندگی کا مزہ ہی کیا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" —— "کچھ نہیں!" —— ستالو۔ تمہاری جان پہلے ہی آدھی رہ گئی ہے۔"

مسعود وہیں لیٹ گیا اور آنکھیں موند کے سونا اڑا لے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے خراٹوں کی آواز آئی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا اور اس کا ساتھی بے خبر سو رہا تھا اب موقع ہے اٹھو۔ قندیل سے جتنا سونا نکال سکتے ہو نکال کر بھاگ جاؤ —— لیکن راستہ؟ —— اس سونے کی روشنی میں ڈھونڈنا نہیں پڑے گا —— اس نے اپنا سانس بھی روک لیا۔ اور اپنے ساتھی پر نظریں جما کر اٹھ کھڑا ہوا —— قندیل کا دروازہ کھولتے ہی اس کے ارد گرد بڑی گہری دھند چھا گئی، جس میں شعاعیں معلق ہو گئیں۔ اس کے لرزتے ہاتھوں میں جتنی ڈلیاں آئیں لے کر بھاگنے لگا۔ زمین بڑے زور زور سے ہلنے لگی اور چاروں طرف آوازوں کا شور اٹھا ——

پکڑو —— دوڑو —— جانے نہ پائے —— چور —— چور ——

اس نے مٹھیوں میں سونا اور بھی دبا لیا —— اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔ —— بھاگو —— دوڑو —— چور —— چور —— وہ بھاگتا ہی جا رہا تھا —— وہ خوفناک آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں —— اس نے سونے کی روشنی میں راستہ پلک جھپکنے میں طے کر لیا —— سامنے دریا تھا —— دو قدم کے فاصلے پر —— آوازیں اور بھی قریب ہو گئی تھیں۔ اس کے بالکل ساتھ —— آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگاتے ہی

جانے کہاں سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی ۔۔۔۔ اور راشن کا سینہ چھلنی چھلنی ہو گیا وہ خوفناک آوازیں بھیانک قہقہوں میں ڈھل گئیں ۔۔۔۔ اس کے ہاتھوں سے سونا گر گیا اور وہ خالی ہاتھوں سے سینے کو سہلاتا ہوا دریا کی تہہ میں اترتا ہی چلا گیا ۔۔۔ سسکتا ہوا ۔

اس کی سسکیاں سن کر روشن دروازے سے باہر جاتے جاتے لوٹ آیا ۔۔۔۔ "کیا ہوا ڈاکٹر صاحب ! ۔۔۔ ابھی تو آپ ٹھیک تھے "

"کچھ نہیں ۔۔۔۔ کچھ نہیں روشن " ۔۔۔۔

اس کے ہاتھ اپنے سینے کے بجائے ، سامنے پڑی ہوئی لاش کے سینے کو سہلا رہے تھے ۔

آنکھ اور سایہ

کوٹھری $\frac{۸' \times ۱۰'}{۱۲'}$

آہنی دروازہ ۵' × ۳'

آہنی دروازے کے بالکل سامنے کھڑکی ۴' × ۳'

کھڑکی کی سلاخیں قطر ۲"

سلاخوں سے باہر تاریکی آزاد۔ سلاخوں کے اندر تاریکی قید —
ابھی تھوڑی دیر میں جب پرندے آسمان پر اندھیرے کا تعاقب کریں گے تو کچھ لوگ آئیں گے اور اسے اس کمرے کی تاریکی سے آزاد کر دیں گے۔ وہ لکڑی کے تختے سے اتر کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے کان اور آنکھیں آہنی دروازے پر لگی تھیں۔ لیکن تالے میں ابھی زبان نہیں پڑی تھی۔ دروازے کے درمیان گول سوراخ میں کوئی آنکھ نہیں تھی۔ یہ

لوگ آتے کیوں نہیں ہیں ؟ میں گزشتہ دو مہینوں سے ان کا منتظر ہوں، وہ
اُٹھ کر بستر کے قریب آ کے کھڑا ہو گیا اور بستر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ بستر برف
کی سِل تھا۔ بغیر سلوٹ کے اور سرد پائینتی کی طرف کمبل پڑا تھا، تو آج رات
میں بالکل نہیں سو پایا۔ مجھے نیند تو آ رہی تھی۔ لیکن میں شاید سونا بھول گیا تھا، بستر
پر کمبل بھی پڑا ہے، سردیاں ہوں گی۔ مجھے تو ٹھنڈ بالکل نہیں لگ رہی۔ شاید
اس بار سردی جلد ختم ہو گئی ہو، وارڈ وغیرہ کو کمبل اٹھوانا یاد نہیں رہا ہو گا۔ وہ
مسکرایا۔ لیکن اس کے ہونٹ فوراً ہی سکڑ گئے کیسے ممکن ہے کہ مجھے یہاں سے نکالنا بھی
اسے یاد نہ رہے۔۔؟ اس نے دروازے کی طرف ــــــ جب وہ آئیں گے
تو میں مسکرانے لگوں گا اور بڑے سکون سے ان کے ساتھ جاؤں گا۔ کیونکہ
آج تک جتنے بھی لوگ میری طرح اس کمرے میں آ کر نکلے ہیں، ہمیشہ بڑے
سکون سے مسکراتے ہوئے نکلے ہیں۔ اس نے آنکھیں موند کر انگڑائی لی۔
میں اتنا تھکا ہوا کیوں ہوں؟ ــــــ اس نے بستر کی طرف پھر دیکھا۔ اور میں
ساری رات کمرے میں گھومتا رہا ہوں۔ اور مجھے سونا یاد نہیں رہا ہو گا۔۔
اس نے جمائی لی ــــــ اس کا بدن ٹوٹنے لگا ــــــ اور وہ بستر پہ بیٹھ گیا،
آ جاؤ کمبختو، میں بہت تھک گیا ہوں ــــــ وہ لیٹ گیا ــــــ

”میرے لعل“ اس کی ماں کے پوپلے منہ سے آواز آئی تھی۔ اور وہ
اپنے برقعے کا نقاب اٹھا کے اسے بس دیکھنے لگی تھی۔

”بانہیں کرو ماں ــــــ مجھے اس طرح نہ دیکھو۔“
بلکہ فوراً مجھے اپنی گود میں چھپا لو۔ آج پھر میں مسجد سے بھاگ گیا تھا۔

اور ابا نے مجھے مسجد کی دیوار کے ساتھ اخروٹ کھیلتے دیکھ کر بہت پیٹا ہے اور وہ پھر مجھے پیٹنے آرہا ہے، وہ کہتا ہے، آج وہ مجھے بالکل مار دے گا۔

"بڑا آیا مارنے والا۔"

"اس حرامی نے آج پھر سپارے کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"میرا ایک ہی بچہ ہے: اسے بھی مار کے دم لوگے؟"

"نکما، حرام زادہ"

"مجھے اپنی گود میں چھپا لو ماں ــــــ تم چپ کیوں ہو؟ دیکھو میں خود ہی نہا دھو کے آیا ہوں اور تمہیں میرے پیچھے بھاگنا نہیں پڑا۔ میں نے نئے کپڑے پہنے ہیں اور بال بنائے ہیں۔ میری بلائیں لو تاکہ مجھے نظر نہ لگ جائے۔

"بائیں کروناماں۔ ہمارے کرایہ دار کا لڑکا ہسپتال میں تھا۔ اب اس کا کیا حال ہے؟"

"میرے ہیرے۔"

"ماں اس کے سینے کے ساتھ لگ کر رونے لگی تھی وہ بھی پھوٹ پھوٹ کے رو دیا تھا۔ لیکن اس کے آنسو نہیں بہے تھے اور آواز بھی حلق سے نیچے رہی تھی۔

"میں رو تو نہیں رہی تھی یوں ہی دل بھر آیا تھا۔"

"اس میں رونے کی بات ہی کیا ہے سنا ہے ایسے موقعوں پہ تو لوگ خوش ہوا کرتے ہیں۔ اور میں بہت خوش ہوں۔ بہت ہی خوش سا اس نے چاروں اور دیکھا تھا۔

"میں تمہارے لیے مٹھائی لائی ہوں۔ ماں نے برقعے سے لفافہ نکالا۔
تمہیں برفی پسند تھی نا۔"

اس نے لفافہ کھولا اور برفی سے متلی ہونے لگی، سر چکرانے لگا۔ پیٹ میں
بل پڑنے لگے۔ میرا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہتا۔ برفی بھی نہیں، مجھے
بھوک نہیں لگتی ———— "تم کتنی اچھی ہو ماں۔"
"لاؤ میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں۔"

اس کی ماں نے لفافے سے برفی کا ٹکڑا نکال کے اس کے منہ میں ڈالا
ماں مجھے قے آرہی ہے۔ نہ نہ ماں۔ بس بس۔ وہ اپنی ماں کی اس حرکت پر
ہنسنا بھی چاہتا تھا۔ اب مجھ پر گوٹے والا دوپٹہ ڈال کر دنا صاحب سلام
کرانے بھی لے جاؤ گی۔؟ ———— بس کرو۔ اب میں قے کر دوں گا۔ اس نے
پیٹ پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

ماں نے خالی لفافہ پرے پھینک کر اسے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ اتنی
زور سے نہیں ماں۔ اس طرح تم مجھے اپنے سینے کے اندر تھوڑا ہی چھپا
لو گی۔ ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی چپکے چپکے رو رہی جا رہی تھی
اور اسے نیند آنے لگی تھی۔

میری پگلی ماں ———— وہ مسکرایا۔ بازار میں بچے کھیلتے کھیلتے بڑے
ہو گئے ہیں۔ میرے تینوں دوستوں نے اپنا اپنا کاروبار سنبھال لیا ہے۔
دودھ دہی کی دکان۔ رہبڑا اور جوئے کی بیٹھک۔ سب اپنے فارغ
اوقات میں بھنگ پیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور شادی

شدہ ہونے کے باوجود گاتا سننے کے بعد اکثر ان ہی کے کوٹھوں پر سوتے ہیں
میرے چوبیس گھنٹے فارغ ہیں۔ کبھی کبھی ان میں اکتائی ہوئی گھڑیاں بدمست
کا دھیڑا، دریا کا کنارہ اور دوڑ۔ اکتائی گھڑیاں، سموں کے نیچے، پھر وہی
چوبیس کے چوبیس گھنٹے فارغ —— تو کوئی بھی کام کر۔ اس کا باپ گرجا۔ ابا
مجھے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے تم نے لکھا تھا کہ بینک سے جو مکان بنوایا ہے اس کا آدھا
حصہ اور نیچے کی دو کانوں کا کرایہ ہمارے لئے بہت ہے —— ماں میں تانگے
گھوڑے سے بھی اکتا گیا ہوں — بیٹے ابھی گنتی کے چار دن ہی تو ہوئے
ہیں —— لو ماں پیسے —— میں تانگہ گھوڑا بیچ آیا ہوں —— فٹے منہ
او ملعونی حرامزادے —— وہ باپ کے غصے پر ہنسنے لگا —— اس کی ہنسی
ہونٹوں پر سمٹتے سمٹتے اداس ہو گئی تھی۔ وہ سر نیوڑھائے بیٹھا تھا سامنے
کھڑے والی چارپائی کے اوپر سیاہ چادر تھی۔ اور اس کی ماں رو رو کر ہلکان
ہو رہی تھی۔ اب تو خرچ پھر بھی کم ہو گیا ہے —— اب ہم دو رہ گئے ہیں۔
بیٹا میں بہو لا دوں گی —— نہیں ماں ابھی تو میرے کھانے پینے کے
دن ہیں —— وے ان لفنگوں کے ساتھ نہ بیٹھا کر —— تو پھر میں کیا
کروں —— وے یہ حرامی تمہیں خراب کر دیں گے۔ ماں یہ مجھے کیا خراب
کریں گے —— یہ تم چارپائی پر لیٹے لیٹے کیا سوچتے رہتے ہو —— یہ صرف
کچھ نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ تمہارا دماغ الٹی باتوں میں مصروف رہتا ہے۔
وڑتا۔ نکھٹو —— اگر میں اتنا ہی بیکار ہوں تو پھر مجھے اس چارپائی پر لیٹے
لیٹے —— ماں میں بیکار کہاں ہوں، میں تو بھنگ پیے ہوئے ہوں۔ دراصل سب

بکچھ بکواس ہے۔ زندگی بکواس ہے ۔ دنیا میں جو چیز بکواس ہے اسے زندگی کہنا چاہیئے ۔ مثلاً رس پکڑی بوٹی کو بھوگ نہیں بلکہ زندگی کہنا چاہیئے۔ ماں میں بھوگ ہوں ؟ میرا رس کہاں گیا ؟ ـــــ میں زندہ ہوں ۔ میری بوٹی کہاں ہے ؟ میں بھنگی ہوں ، ساری دنیا بھنگی ہے ۔ کیوں کہ سب زندہ ہیں ، تو پھر مر جانا چاہیئے ۔ ـــــ اد ہنہ ہوں ۔ ـــــ خود ہی بھوک کی طرح سو کھ کر ہوا میں بکھر جاؤں گا ـــــ سب بکھر جائیں گے ۔ چھت کی کڑیاں کتنی ہیں ـــــ یہ کمرہ ڈول رہا ہے ۔ تو بھی ڈول رہی ہے ماں ـــــ تو بھی بھنگی ہے ـــــ ہا ـــــ ہا ـــــ ہا ـــــ ہا ـــــ دے قہقہ ای ہنہ ـــــ وہ آنکھیں بند کر کے ماں کے سینے کے ساتھ لگ گیا تھا ۔

کسی نے اس کا کندھا ہلایا ۔ داروغے نے کہا ـــــ " کتنے مزے سے سو رہا ہے ؟

اس نے آنکھ کھولی ـــــ سرمئی اندھیرے میں سائے تھے ـــــ

" جانے ان لوگوں کو نیند کس طرح آجاتی ہے "، مجسٹریٹ نے کہا ۔

" نیک مقصد کے لئے جان قربان کر دینے میں سکون تو بہت ہے ۔ مخار نے جیسے اپنے آپ سے کہا ـــــ

" اٹھو بھئی "، داروغے نے اس کا کندھا پھر ہلایا ۔

اس نے آنکھیں کھولیں ـــــ چار دن اس پر جھکے ہوئے تھے ـــــ وہ یکایک ڈر گیا ۔ کون ہو تم لوگ ؟ ـــــ اس نے کہنیوں کے سہارے خود کو بستر کے پیچھے گھسیٹا ۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا ۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ

کر بھاگ جائے۔ باہر دروازے کے وسطی گول سوراخ میں آنکھ تھی۔ لیکن میں کیوں بھاگوں۔؟ اگر بھاگنا ہی تھا تو اتنا سفر طے کر کے یہاں کیوں آیا تھا ——— اور اگر کوشش بھی کروں تو ——— دروازہ بند ہو گیا تھا اور باہر سوراخ میں لال آنکھ تھی۔

"خوب نیند آئی؟ ——— ڈاکٹر نے ٹوٹیاں جیب سے نکال کے گردن کے ساتھ اٹکا لیں اور نبض پر انگلیاں رکھ دیں

جی ہاں ——— خوب مزے سے سویا۔" ——— اس نے جمائی لی اور مسکرایا
ان بیچاروں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "اس قسم کے قاتل اس طرح کیوں ہوتے ہیں۔ " ——— داروغہ بڑبڑایا۔

"ڈاکٹر صاحب ——— میں بیمار نہیں ہوں۔"

ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کیا کہے "نہیں، نہیں" ——— اس نے اس کے سینے سے سویٹر اور قمیص ہٹا کر ٹوٹیوں سے دل کی آواز سنی۔ "ٹھیک ہی ہے۔" ——— ڈاکٹر نے ٹوٹیاں جیب میں ڈال لیں۔

"چلو" ——— داروغے نے کہا۔

اس نے اٹھتے ہوئے اچانک سوال کیا۔ "اگر بیمار ہوتا تو؟"
"تو تمہارے صحت مند ہونے تک انتظار کرتے۔ مجسٹریٹ نے کہا۔

"ہوں!" ——— اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی ——— میں بیمار ہوں ——— بہت ہی بیمار ——— مجھ سے اٹھا نہیں جاتا ——— میں بالکل سن ہو گیا ہوں ——— آپ لوگ دیکھتے نہیں ——— تم میری نبض پھر دیکھو ڈاکٹر...

"اٹھو جلدی کرو" — داروغہ نے اپنی جیبی گھڑی نکال کر دیکھی۔
"وقت ہو رہا ہے"

"ہوں" اس نے داروغہ کے ہاتھ کی طرف دیکھا، جس میں گھڑی تھی۔
اس نے باری باری سب کو دیکھا، اور اس کی نظریں پھر داروغہ کے ہاتھ میں گھڑی کے ساتھ ساتھ ہلنے لگیں — ٹک ٹک ٹک ٹک۔ اس کے سینے کے اندر بھی یہی آواز ٹک ٹک کی آواز گھڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگی اور وہ دل گھڑی کی طرف — اٹھو۔۔۔ گھڑی کی نیم پگھلی موم زمین پر رفتہ رفتہ اترنے لگی، سینے کی آواز گھڑی کے باہر اور گھڑی کی آواز سینے کے باہر۔ ۔۔۔۔

دستک۔ ٹک ٹک ٹک ٹک — آواز کہاں ہے؟ سوئیاں کہاں ہیں؟ حرف کہاں ہیں؟ وقت ہو رہا ہے، کتنے بجے ہیں؟ ہم نہ وقت ہو رہا ہے۔ اس گھڑی میں تو آواز ہی نہیں، وقت ہی نہیں۔
اور — ڈاکٹر — میں بیمار ہوں — میرا دل دھڑک رہا ہے، دیکھو دیکھو۔ تو ٹوٹوں سے دیکھو" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے بیٹھے سینہ بڑھایا۔

سب ہنس پڑے — "جانے ان لوگوں کو تختے پر بھی کیوں ہنسی سوجھتی ہے"، شاگرد ب نے اپنے آپ سے کہا۔
"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ واقعی گھڑی تو — اس نے داروغہ کو جیب میں گھڑی ڈالتے ہوئے دیکھا — میں آپ کی گھڑی دیکھ

سکتا ہوں ـــــ ؟

داروغہ نے گھڑی نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ وہ مسکرایا ـــــ

چلئے۔ ـــــ

دروازے کی دہلیز میں وہ رک گیا۔ اس نے پلٹ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں اب اس کمرے میں کبھی نہیں آؤں گا ـــــ وہ خوش تھا۔ مگر پھر بھی اس نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا اور وہاں کی ہوا کو پوری طرح پھیپھڑوں میں بھر کے نکل آیا۔

اس نے کوٹھری سے باہر آکے پُر زور انگڑائی لی اور سرمئی اندھیرے میں ان چاروں کو دیکھا۔ ان کی شکلیں بہت دھندلی سی تھیں۔ اس کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ ستارے نیلاہٹ مائل سیاہی میں گھُل کر پھیل رہے تھے۔ اس نے باری باری پھر ان کو دیکھا۔ ان کے چہرے بھی پانی میں سیاہ رنگ کے چھینٹے تھے جو رفتہ رفتہ پیندے کی طرف اُترتے پھیل رہے تھے۔ اس نے فوراً اپنی آنکھیں ملیں۔ اس کی انگلیاں آنکھوں میں دور تک اترتی چلی گئیں۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا آسمان کے سمندر میں طوفان آرہا تھا۔ بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں اور ان لہروں پر دو آنکھیں ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں۔ یہ آنکھیں کس کی ہیں ؟ دیکھو دیکھو داروغہ جی یہ آنکھیں کس کی ہیں مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔ آپ لوگ کہاں ہیں۔ ؟ " ـــــ

"ہم تمہارے ساتھ ہیں"

"اب اور کتنی دور جانا ہے۔"

"وہ سامنے دیوار سے ذرا ہٹ کر ـــــ وہ پوچھتا"

دیوار کہاں ہے؟ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ میں تو ان کے ساتھ دروازے سے باہر نکلا تھا۔ لیکن میرا قدم کہاں پڑا ہے؟ میں اونچی اونچی دیواروں میں کیسے گھر گیا ہوں؟ اور دیواروں میں غاروں کے منہ کھلے ہیں یا شاید کمروں کے دروازے ہیں، اور سیڑھیاں ہی سیڑھیاں دیواروں سے اترتی ہوئی یا آسمان پر چڑھتی ہوئی۔ ٹوٹی پھوٹی۔ نئی نئی، جو ان کمروں میں جارہی ہیں یا ان کمروں سے آرہی ہیں۔ اور یہ تنگ راستہ جس کے ہر قدم پر موڑ ہے اور جس پر بہتی دھند کی تہ میں پیر کھو گئے ہیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں؟ ـــــ سامنے صرف ایک آئینہ ہے۔ سانس کی ہواؤں سے دھندلایا ہوا، چاروں اور دھواں ہی دھواں اور دھوئیں میں ابھرتی سیڑھیاں، دیواریں اور دیواروں میں پھٹے غاروں کے منہ۔ یہ سب کچھ میں دیکھ رہا ہوں؟ ـــــ نہیں۔ میری بھنوؤں کے نیچے دو سوراخ ہیں۔ اور آنکھیں وہاں سمندر میں ہچکولے کھارہی ہیں۔ نیچے دھند کی تہہ میں میرے پیر ہیں اور اوپر پانی میں پھیلتے ہوئے سیاہ دھبے ہیں لیکن سنا ہے تب آسمان پر کوئی طوفان نہیں آیا تھا۔ پانی میں دھبے نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی تھی اور اس کا بیٹا صاف و شفاف کپڑے پہنے اس کی چھری کے نیچے لیٹا تھا۔ جب چھری چلانے کے بعد اس نے آنکھوں سے پٹی کھولی تھی تو دنبہ ذبح پڑا تھا۔ اور اس کا بیٹا پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اور مسکراتا ہوا کھڑا ہوں۔

نہیں میں تو چل رہا ہوں، اور دھند کے پہیوں پر پھسل رہا ہوں، اور مجھے کسی سامنے کی دیوار سے ذرا ہٹ کر چوکھٹے تک پہنچنا ہے ـــ میں نہایا تھا اور صاف کپڑے پہنے تھے اور میری ماں نے کہا تھا کہ حوصلہ کرو تم قربان ہو رہے ہو۔ تب بھی مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اور میری ماں رو رہی تھی، دیکھو میرا کتنا حوصلہ ہے کہ میں اتنی خوش ہوں اور میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا کہ اس کی آنکھوں میں خوشی پانی بن گئی تھی یا غم ـــ میں چل رہا ہوں یا کھڑا ہوں اور میرے پاؤں دھند میں گھل کر بہہ رہے ہیں، چوکھٹے کی طرف۔ لیکن۔ چوکھٹا ہے کہاں ؟ ـــ یہ بھول بھلیاں ہیں، ہر قدم موڑ ہے اور ہر موڑ پر چوکھٹے کا خیال کہ اب سامنے ہوگا، اور وہاں میری گردن پہلے ہی موجود ہوگی۔ میری ماں بھی کتنی بے وقوف ہے، اور میں اس سے بھی زیادہ۔ کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں اگر واقعی یہ قطعی ناممکن ہے، میری آنکھیں میری ہی باندھی ہوئی پٹی کے پیچھے سے نکل کر آسمان کی لہروں پر آگئی ہیں اور میں خود چھری کے نیچے لیٹا ہوا ہوں چھری کے نیچے گردن کس کی ہے ؟ آسمان کے بھنور سے آنکھوں نے پہچاننے کی کوشش کی اور اس غار کے منہ سے لال دھواں کیوں نکل رہا ہے۔ اتنا سرخ دھواں، میں اس کمرے کی سیڑھیوں پر کیوں اتر رہا ہوں ؟ اس دھوئیں میں میرا دم گھٹ رہا ہے، مجھ سے جلتے مردے ایسی بدبو برداشت نہیں ہوتی یہاں سے فر فر کی آوازیں کیوں آرہی ہیں۔ ایسی آواز تو بکرے کی شہ رگ کٹنے پر آتی ہے ـــ فر فر ـــ یہ کون تڑپ رہا ہے ـــ آنکھوں کی اوٹ

سے غور سے دیکھا ــــ یہ تو ــــ یہ تو میں بیٹھا ہوں اور ــــ اور ــــ میرے ہاتھ میں چھری ہے۔

سامنے سرخ تالاب میں لاش تیر رہی تھی اور قالین پر پھیلتی ہوئی خون کی سرخ انگلیاں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کٹی ہوئی گردن سے خرخراہٹ کی آواز آئی اور وہ گھبرا گیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ تو میں نے دکان کے اندر داخل ہوتے ہی بند کر دیا تھا تو یہ آواز ؟ ــــ سامنے پڑے ہوئے جسم نے جھرجھری لی۔ گردن سے پھر آواز آئی اور اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چھری کو دیکھا، چھری کی نوک پہ خون کی بوند گرنے گرنے اٹک گئی تھی۔ میں نے اس کو واقعی قتل کر دیا ہے ؟ ــــ یہ دروازہ بند کر کے دن بھر کی کمائی گن رہا تھا۔ میں نے اندر آ کے پہلے دروازے کی کنڈی لگائی تھی اور ردی خریدنے کے بہانے اسے کتابوں کی الماری کے پیچھے لے گیا تھا اور پھر ــــ اس کے ہاتھوں میں چھری کانپنے لگی اور چھوٹ کر خون میں جا گری ــــ خون کی انگلیاں اس کی طرف بڑھتی بڑھتی جم گئیں۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا ــــ نہیں ــــ نہیں ــــ یہ میرے ہاتھ نہیں ہو سکتے ــــ میں اسے قتل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ چھری اس جن نے چلائی ہوگی ــــ اس کا قاتل جن ہے ــــ تم لوگ مجھے اس لاش کے پاس تنہا کیوں چھوڑ گئے ہو ــــ تم کہاں ہو ــــ ماں میں تنہا ہوں اور یہ خون ــــ اس کے اردگرد سرخ دھواں ابلنے لگا ــــ یہ خون میں نے

نہیں کیا۔ بھوت کی پرچھائیں، جن کا سایہ مجھ کو یہاں لاکر چھوڑ گیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ماں، ابلتے ہوئے دھوئیں میں جھریوں والا ہاتھ ابھرا۔ یہ لو میرے بیٹے اسے گلے میں ڈال لو —— وہ تعویذ کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھا اور ہاتھ پیچھے ہٹنے لگا —— لاؤ نا ماں وہ آگے بڑھا، ہاتھ اور پیچھے۔ وہ اور آگے، تعویذ ہاتھ سے پھسلتا پھسلتا چھوٹ کر گر پڑا۔ اور جھریوں والا ہاتھ آہستہ آہستہ مضبوط مردانہ ہاتھ میں ڈھل گیا۔ یہ ہاتھ کس کا ہے ؟ —— میرے ہاتھوں جیسا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ نہیں تھا۔ سامنے دھوئیں میں دوسرے ہاتھ سے خون کی بھاپ ٹھنڈی ہو کر بہہ رہی تھی۔ یہ تو میرا ہاتھ ہے۔ اس نے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اور ہاتھ بھاگنے لگا۔ وہ ہاتھ کے پیچھے۔ یہ ہاتھ مجھے کھینچ کے کہاں لے جا رہا ہے ؟ یکدم سرخ دھواں چھٹ گیا اور وہ ہاتھ اندھیرے میں غائب ہو گیا! اندھیرے میں شام کی پیلاہٹ ابھری اور وہ سہم کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ سامنے آسمان پر جلتے ہوئے کوئلے کی آگ دور زمین پر گر رہی ہے۔ اس کا وجود آہستہ آہستہ پگھل رہا ہے۔ تا حدِ نگاہ زمین سے چھریاں اُگ رہی ہیں۔ جلتے ہوئے کوئلے کی آگ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ چھریاں بھی دہکنے لگی ہیں۔ اس کا وجود پگھل کر زمین پر بہنے لگا۔ سایہ پھیل رہا ہے آہستہ آہستہ دہکتی چھریاں اس کے ماس کو جلا رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ کاٹ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ —— وہ کرب میں چیخ رہا ہے۔ چلا رہا ہے ——

لیکن بہتے ہوئے ماس کو چھریوں کے دو گنے دو گنے چھل کاٹ رہے ہیں، اور تاحدِ نگاہ اس کی بوٹیاں پھیلتی چلی جا رہی ہیں، اور اُن کا سر آسمان پر جلتے آگ کے گولے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آسمان سے گرتی آگ سر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کونے میں کھڑے اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس آگ کو روکو، میری ایک ایک بوٹی میں دماغ ہے، سر کو آگ کی طرف بڑھنے سے روکو ورنہ.... میرا نچلا دھڑ پتھر ہو گیا ہے —— ہل نہیں سکتا —— ماں —ماں —— بڑھ کے آگ کو روکو —— ماں —— میرا سر اس نے آنکھیں بند کر کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا —— آگ نے سر کو چھوا، وہ چیخ اٹھا —— "مر گیا ماں" ——

"کیا ہوا میرے پتر، میں واری جاؤں۔" "ماں میرا سر"

"ہائے میرا جوان جہان پُتر۔ تمہیں ضرور کسی جن بھوت کا سایہ ہو گیا ہے آج تم پھر خواب میں ڈر گئے ہو صبح ہوتے ہی تعویذ جا کے لے آؤں گی"

"لیکن تعویذ والا ہاتھ غائب ہو گیا ہے اور میرا ہاتھ بھی کلائی کے ساتھ آن جڑا ہے اور میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ چھری میرے پاس نہیں، اسے جن نے قتل کیا ہے —— اس نے تاریک کمرے سے جھانک کر سُرخ دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سامنے جن کا سایہ ہے —— سرخ سرخ دھواں بن کر پھیل رہا ہے —— وہ دیکھو —— وہ دیکھو اسی کے ہاتھ میں چھری ہے ——" اسے میں نے قتل نہیں کیا ——

"یہ تو ثابت ہو چکا ہے" —— مجسٹریٹ نے زیر لب کہا ——

"لو سگریٹ پیو۔" داروغہ بولا۔

مسکراؤ آخری وقت چہرے پر سکون ہوا کرتا ہے۔ خاکروب نے زیرِ لب کلمہ بھی پڑھا۔

"ہم پھانسی کوکب تک پہنچیں گے؟"

"شاباش خاکروب نے دل میں کہا"

"وہ سامنے چوکھٹا ہے۔ دس بیس گز کے فاصلہ پر۔"

اور مجھے کمرے سے نکلے صدیاں بیت گئی ہیں۔ لیکن چوکھٹا نظر نہیں آتا۔ آنکھوں نے آسمان کی سب سے اونچی لہر پہ چڑھ کر دیکھا۔ اور وہ دوسری لہر میں اتر گئیں، یہاں چاروں اور پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی دھند ہے۔ میں سیڑھیاں اتر رہا ہوں۔ لیکن زمین نہیں آتی۔ سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ لیکن آخری سیڑھی کے بعد ایک اور سیڑھی ہوتی ہے۔ میں بہہ رہا ہوں لیکن میرے پیر سینے تک بھی دھند کی تہ میں کھوگئے ہیں اور دیواروں میں غاروں کے منہ ہیں۔ کمرے کا دروازہ پھر اسی کمرے میں کھلتا ہے۔ ابھی کمرہ دن ہے جو پلک جھپکتے گزر جاتا ہے۔ ابھی غار رات ہے جو ربڑ کی طرح تنتی ہی چلی جاتی ہے۔ نیند روکنے سے بھی نہیں رکتی، بینڈر کے ساتھ ہی گزرتا ہوا دن سیاہ لبادے میں بڑے بڑے دانت نکالے آجاتا ہے اور رات اور بھی لمبی ہوجاتی ہے۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ ایک میدان میں بہتے سرخ دریا کے کنارے چلتا جا رہا ہوں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کا پانی کیوں سرخ ہو رہا ہے۔ میدان میں دور دور تک درختوں کا نشان نہیں۔ چلتے چلتے مجھے قہقہوں کی آواز سنائی

ڈوبنے لگی ہے ۔ جو رفتہ رفتہ میری قریب ہوتی جا رہی ہے ، اور قریب ۔ بالکل میری بائیں طرف ـــــ میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا ۔ میرے بالکل قریب بڑی بڑی سوکھی شاخوں والا درخت ہے جس کی ہر شاخ کانٹا ہے ، اور ہر کانٹا میرے کٹے ہوئے سر میں پیوست ہے ۔ اور انہی سے خون گر رہا ہے ، قطرہ قطرہ اور یہیں سے دریا کا پانی لال ہو رہا ہے ، درخت کے تنے کے پیچھے سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہیں ۔ میں نے درخت کی اوٹ سے دیکھا ، تو وہاں ـــــ وہاں ۔ ـــــ کتابوں کے تخت پر اخباروں کے کاغذوں سے بنا کوئی جسم بیٹھا پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہے ، میں اسے غور سے دیکھتا ہوں تو اس کی شکل بالکل بازار کی نکڑ والے لالے کی طرح ہے ۔ اسی طرح بوڑھی بھی اس کے سامنے میری لاش پڑی ہے ۔ اور وہ بار بار انگلیوں سے میری شہ رگوں سے کوئی شئے نکالنا چاہتا ہے ۔ میں اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں ، مگر مجھ سے ہلا نہیں جاتا ، اس نے میری شہ رگوں کو خالی کرنے کی کوشش سے تنگ آ کر مجھے کتابوں پر لٹا دیا اور کتابوں کو آگ لگا دی ۔ میرا دھوئیں میں دم گھٹ رہا ہے ۔

مجھے بچاؤ ـــــ ماں ـــــ مجھے سانس نہیں آتا ۔ ـــــ میرا دم ـــــ ماں ـــــ پانی ـــــ "

" لو میرے بچے لو "

" ہاں یہ بھی میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا ـــــ یہ سایہ "

گلے کی زنجیر میں ایک اور تعویذ ۔

"ماں دن کو تو میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"تم کوئی نیک کام کرو۔ تو تعویذوں کا کوئی اثر بھی ہو۔"

"ماں وہ ٹکڑ پر سڈی والا لالہ میرے خوابوں میں کیوں آتا ہے"،

"تم اس دکان کی طرف نہ جایا کرو۔ کوئی نقصان نہ پہونچا ئے۔ تم خواہ مخواہ اس سے جھگڑا مول لیتے ہو، بازار میں اور اتنے ڈنکرے کیا کم ہیں۔"

"تم نہیں جانتیں ماں۔ وہ اسے بڑی بڑی گالیاں دیتا ہے، جو ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے اور اسے بھی جو ہمارے دل میں دھڑکتا ہے۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے، میرا یار بیٹھک والا کہہ رہا تھا۔ کہ"

"تم نہ ان لفنگوں، حرامزادوں کے ساتھ بیٹھا کرو۔ انہی قاتلوں کو اس سے نپٹنے دو۔"

وہ مسکرایا —— "میں نے تو آج تک مرغی بھی حلال کر کے نہیں دیکھی ماں"۔ لالے کو وہ خود ہی سنبھال لیں گے۔ لیکن یہ کمبخت مجھے کیوں ڈراتا ہے عجیب جھنجھٹ ہے۔ خواب اس کے ذہن میں پھر گھوم گیا۔ اس نے تعویذوں پر ہاتھ رکھا اور اسے آیت الکرسی جتنی یاد تھی پڑھ کے سینے پر پھونک ماری اور سو گیا۔

ماں کی ہدایت کے باوجود صبح بیٹھک کی طرف آتے وہ لالے کی دوکان کے سامنے ہو کر آیا تھا، اور ہنستے ہنستے یاروں کو سارا قصہ سنایا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکدم خالی الذہن ہو کر چپ ہو جاتا۔ کوئی کہتا "پھر"، اور بات پھر جا ہی ہو جاتی۔

"یار کہیں واقعی مجھے جن نہ چمٹ گیا ہو" اس نے یکدم سنجیدہ ہو کر کہا۔"

" ویسے اس لالے کو ٹھکانے لانا تو بڑے ثواب کا کام ہے۔ سُنا ہے اب اس نے تبرّوں سے بھری کوئی کتاب لکھی ہے۔"

" میں بتاؤں، کسی سے ان خوابوں کی تعبیر پوچھو۔ ہمیں تو ایسے سفنے کبھی نہیں آتے؟"

" تعبیروں کو مارو گولی۔ کسی طرح میرا ان سے پیچھا چھڑا دو۔"

" اچھا سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم سارا دن کیا سوچتے رہتے ہو؟"

" کچھ بھی نہیں —— کیوں؟"

" تو پھر اس کا علاج بھی نہیں۔ اگر تم سوچتے ہوتے تو سیدھا سا علاج تھا۔ تم وہ کچھ سوچنا بند کر دینے اور۔"

ہنسی

یار میرا مذاق نہ اڑاؤ —— میں بہت پریشان ہوں"

" تو پھر لگے دم، مٹے غم"

اس نے سگریٹ کا دم لگایا اور غم کو مٹاتے مٹاتے لمبی چپ میں اتر گیا۔

واقعی میں سارا دن کیا سوچتا رہتا ہوں؟ —— کیا کرتا رہتا ہوں؟ ——

میں سوچتا رہتا ہوں کہ وقت کیسے گزارا جائے۔ اور کرتا یہ رہتا ہوں کہ وقت گزارتا رہتا ہوں۔ —— بڑی سیدھی بات ہے وہ ہنسا۔

اسے آئندہ سگریٹ بھر کے نہ دیا کرو۔ اسے غم نہیں ہوتے۔

اب یہ ذرا ٹھہر کے ہی واپس آئے گا۔

واپسی پر جوا —— پھر شراب —— کوٹھے پر گانا ——

اور پھر پل بھر میں گزرا ہوا، سیاہ لبادے میں دانت نکلے دن - جن کا سیاہ رات
ربڑ کی تنتنی ہلتی رہتی - اور لمبی پیروں میں بندھے گھنگھروں سے لالے کی ہنسی
کی آواز اور سازوں کے گلے میں آندھیوں کا شور —— ہا ہا ہا —— شوں
شوں —— جنگل میں درختوں کا شور اور گرد و غبار میں ابھرتی مٹتی خوفناک شکلیں
وہ زمین کے ساتھ چپک کر رینگ رہا تھا۔ پر میں اتنا چھوٹا کیوں ہو گیا ہوں، اب یہ
مجھ سے تیز کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے بھاگنا چاہا۔ لیکن پھر فوراً ہی گھاس کی پتی
سے چپک گیا۔ آندھی، گردے کی چڑیلوں کے دانتوں سے زیادہ تیز تھی۔ وہ
پھر زمین پر اتر آیا اور رینگنے لگا اور رینگتے رینگتے اس کا جسم دکھنے لگا۔ اس کے
گرد چڑیلوں کا ناچ تھمنے لگا اور اس نے دیکھا وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے،
کوئی زنجیر کے دوسرے سرے سے اسے کھینچ رہا ہے، کھینچنے والا اسے نظر
نہیں آتا۔ چڑیلیں ناچتی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں جب وہ انہیں غور
سے دیکھتا ہے تو ان کے چہرے کا ماس سکڑتا سکڑتا برادہ بن کر ہوا میں اڑ جاتا ہے
اور ان کے دل کی جگہ پر بغیر سوئیوں کے گھڑیاں ٹک ٹک کرنے لگتی ہیں ہر قدم پر
ہنسی کی آواز بڑھتی جاتی ہے۔ اور وہ چلتا جا رہا ہے جنگل کی بھول بھلیوں
میں چلتے چلتے یک دم سب کچھ رک جاتا ہے، وہ نظریں اٹھا کر سامنے دیکھتا
ہے تو زنجیر کا دوسرا سرا لالے کے ہاتھ میں ہے، قریب بہت بڑا الاؤ جل رہا
ہے، جس کے گرد لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے آگے کتابوں کا انبار
لگا ہے، اور کچھ وقفے کے بعد ایک کتاب اٹھاتا ہے اور الاؤ میں پھینک
دیتا ہے۔ لالہ مسکراتا ہوا اس کی زنجیریں کھول دیتا ہے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا

ہے۔ وہ لوگوں کی طرف دیکھتا ہے، تو اس میں اس کا دوست بھی بیٹھا نظر آتا ہے، وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے، اور دوست اسے اشارہ کرتا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے۔ اس کی کنپٹیاں پھڑکنے لگتی ہیں اور وہ بڑے غصے میں لالے کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ آگ کے بالکل پاس پڑی ہوئی ایک لاش ملتی ہے، جس کے سینے سے لالہ چھری سے دل نکال رہا ہے۔ یہ میں ہوں؟ دوست اثبات میں سر ہلا دیتا ہے، لالہ دل نکال کر اس کی بوٹی بوٹی کر کے کھا جاتا ہے پھر شہ رگ کو منہ لگا کر خون پیتا ہے۔ پھر لاش کا سر کاٹ کر آگ کے گرد پھرنے لگتا ہے ایک چکر ——— دو چکر ——— ساتویں چکر پر سر آگ میں، بغیر سوچوں کے گھڑیوں والی چڑیلیں بھی کہیں سے آگ کے گرد ناچنے لگتی ہیں ——— چوتھا چکر ——— پانچواں ——— تم اٹھتے کیوں نہیں یہ تمہارا سر ہے۔ اسے لالے سے چھین کر لالے کو آگ میں پھینک دو۔۔۔ اٹھو ——— اٹھو ——— زندگی میں ایک کام تو کرو۔

اپنے آپ کو تو بچاؤ ——— تمہارے دل کی دھڑکن، تمہاری شہ رگ سے بھی قریب۔ لالے کے منہ سے خون بہ رہا ہے، یہ چھٹا چکر ہے۔ اٹھو اٹھو اس نے پھر دوست کی طرف دیکھا۔ دوست نے اشارہ کیا۔ وہ لپک کر اٹھا، اور لالے سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اسی چھینا جھپٹی میں اس نے اپنا سر لالے کے ہاتھ سے چھوٹ کر آگ میں گرتے دیکھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔۔۔

تم لالے سے جھگڑ میں پڑتے رہتے ہو ——— میں تو جانوں اسی نے جادو

کر دیا ہے۔

میرا دل، میری شہ رگ، وہ چپ تھا۔

"سارا دن جانے کیا سوچتے رہتے ہو۔ بے کار دماغ بھی برے خیالوں کا گھر ہوتا ہے ــــ اور کیا سارا دن کام نہ کاج ــــ

زندگی میں ایک کام تو کرو۔ اپنے آپ کو تو بچاؤ، کچھ تو کرو، تم نے آج تک کیا کیا ہے؟"

"نہیں میں نہیں کھیلوں گا۔ مجھے پٹنے نہ دینا۔"

"رات پھر سفاّ آیا ہے۔"

"میری مانو تو بھنگ پینا چھوڑ دو۔"

وہ ان کو کھیلتا چھوڑ کر بازار میں آ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے اور کدھر جائے۔ وہ تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بازار کی نکڑ پر کچھ دیر کے لئے رکیں اور پھر بازار میں بھٹکنے لگیں۔ میں کیا ہوں۔ وہ بازار میں یک دم تنہا ہو گیا۔ میں نے آج تک کیا کیا ہے؟ ــ سارے بازار میں کٹی ہوئی زبانیں پڑی تھیں۔ زندگی میں ایک کام کرو۔ اپنے آپ کو تو بچاؤ۔ میں نے آج تک کیا کیا ہے؟ ــــ میں کیا ہوں ــــ مجھے اپنے آپ کو بچانا چاہیے... میں لالے کو یہ ثابت کر دوں گا کہ میں ہوں، اور میرا دل کاٹنے اور شہ رگ سے خون پینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اور میں پھر ماں کو بتاؤں گا، کہ میں بے کار نہیں ہوں، مجھے زندگی کتنی پیاری ہے۔ بے کار لوگوں کو زندگی پیاری ہوتی ہے ــــ اور دیکھو میں اپنی زندگی بچا کے لایا ہوں ــــ لیکن کس طرح کیوں کر

. . . تھڑے پر بیٹھے بیٹھے، اس کا سر چکرانے لگا اور وہ سڑک پر اُتر آیا۔

بازار میں لوگ مصروف تھے، وہ دبے پاؤں چلتا ہوا بازار کی دوسری نکڑ تک گیا اور کنکھیوں سے دوکان کی طرف دیکھا۔ لالہ بیٹھا ردی تول رہا تھا۔ اس کو جھرجھری آگئی، وہ بازار کا چکر لگا کے چھرالے کی دکان کے سامنے تھا، لالہ ہنس ہنس کر گاہکوں سے باتیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں جکڑ لیا، اور قصائی کی دوکان پر آگیا۔ قصائی قیمہ بنا رہا تھا۔ قصائی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا، کہ اس کے ہاتھ میں ٹکوا ہے جو بار بار لکڑی کی ٹھڈ پر گرتا ہے، اور اس کا دوسرا ہاتھ گوشت کو لکڑی اور ٹکوے کے درمیان کھسکاتا رہتا ہے۔ اس نے اس سارے عمل کو بڑے غور سے دیکھا، پھر اس کے باہر کیل پر لٹکے ادھ کٹے بکرے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے قصائی سے مرغی ذبح کرنے کے لئے چھوٹی چھری ادھار مانگی۔

ہاں۔ میں نے چھری مانگی تھی۔ اس نے خون میں گری چھری اٹھا لی۔ اس کے گرد سرخ دھواں دبیز ہو گیا۔ پھر میں اسے ڈب میں اڑس کر پاگلوں کی طرح بے مقصد پھرتا رہا تھا۔ دریا پر بھی گیا تھا، اور چھری سے ریت کا قیمہ بھی بناتا رہا تھا۔ وہ لاش کو دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے اٹھا ــــ اور پھر میں نے شراب پی لی تھی اور پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا تھا، جن مجھ سے علیحدہ ہو گیا تھا اور سامنے کے ہاتھ چھری تھی اور یہ ــــ اور یہ سب کیا ہے چھری

کپڑوں پر یہ خون کیسے سوکھ گیا ہے۔ میں یہاں کیوں ہوں۔ یہ چھری تو میں قصائی سے لایا تھا۔ تو یہ کتنا خوف ناک نظارہ ہے، خون، لاش اور کٹی ہوئی گردن اور چھری میرے ہاتھ میں — اور میں بالکل سلامت ہوں — آج یہ میرے خواب میں نہیں آئے گا۔ میں ابھی جا کر ماں کو بتاتا ہوں — سالئے نے قتل کر دیا ہے سالئے کو۔

"لالہ قتل ہو گیا ہے"

"اچھا — کس نے کیا؟"

"اس نے — اس نے" اس نے تاریکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور چھری تمہارے ہاتھ میں ہے،" دوسرا آدمی بھاگ کھڑا ہوا۔ پر میں نہیں ہوں — وہ بھاگنے لگا — جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگا — میں سیڑھیوں کے قید خانے سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں دھند میں میرا دم گھٹ رہا ہے، سرخ رنگ میں تیز دانت ہیں پر میں نہیں ہوں — بازار میں لوگ سر جھکائے کیوں پھر رہے ہیں؟ کس کے جنازے کے ساتھ ہیں۔ اس نے چیخ کر کہا، لالہ قتل ہو گیا ہے۔ چبوترے کے نیچے سے کتا بھونکنے لگا۔ "وہ دکان میں۔ وہ دکان میں" اس نے کتے سے کہا "خون ہو گیا ہے۔ بازار میں بازگشت تھی۔ کتے نے جیسے سنا ہی نہیں اور دوسرے چبوترے کے نیچے چلا — تم سنتے کیوں نہیں۔ اس نے لوگوں سے کہا — سالئے نے سالئے کو مار دیا ہے۔ کسی نے سر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سب چلتے جا رہے تھے — سو وہ قتل ہو گیا — لوگ قدم آہستہ آہستہ

آہستہ — دیکھو، دیکھو — میرے کپڑوں پر خون ہے۔ لیکن یہ میرے جسم پر نہیں ہیں — میری طرف دیکھو تو سہی — ہاتھ میں چھری ہے۔ لیکن یہ میرا ہاتھ نہیں — خدا کے لئے میری طرف دیکھو۔ اچھا — اچھا — یہ قتل میں نے کیا ہے — ادھر دیکھ لو لو۔ لوگ رک گئے — انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا — ہاں ہاں یہ میں ہوں بے کار آدمی — اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ اور چھری اٹھا کر ان کے سامنے کر دی۔ سیاہ آستین کے منہ میں بال تھے اور بالوں کے ساتھ اس کا کٹا ہوا سر لٹک رہا تھا — نہیں — نہیں — وہ الٹے پاؤں چلتا چلتا مڑ کر بھاگنے لگا — یہ بھی خواب ہے؟ — بازار نعروں سے گونج اٹھا — زندہ باد — لوگ گیت گانے لگے — اس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں — ماں ماں — دروازہ کھولو —

ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ماں میں نے آج زندگی حاصل کی ہے۔

ماں اس کی قمیص پر پڑے خون کے چھینٹے چن رہی تھی۔

ماں سایہ قتل کر کے بھاگ گیا ہے۔

میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ہولے سے کہا۔ اور ماں کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

دارا شکوہ نے اس کے سر پر تھپکی دی، اور اپنے کندھے سے اس کا سر اٹھایا۔

کمبخت دائمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ تاکہ رب نے اسے اپنے دل میں

گالی دی۔

"ہم پہنچ گئے ہیں" ___ داروغے نے کہا ___

"کہاں ؟" ___ اس نے داروغے کو دیکھا، اور پھر سر گھمایا

پیچھے دھند ہی دھند تھی ___ دور ___ اور دور ___ اور اس کے

سامنے دیوار تھی ___ اور دیوار سے ذرا ہٹ کر ___

فلاں ولد فلاں ___ دور دھند سے آواز آئی ___ پاس کھڑا مجسٹریٹ

کاغذ پڑھ رہا تھا۔

لوگوں نے تو مقدمہ جیتنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی ___ سنا تھا

کہ مجھے زیادہ سے زیادہ عمر قید ہو گی ۔ لیکن میں چپ تھا ۔ میرے بیٹے میں

تمہیں خود نہلا دھلا کر کپڑے پہنا کر بھیجوں گی ۔

یہ قاتل کون ہے ؟ میں نے تو سانحے سے نجات حاصل کی ہے ۔ یہ

شہید کون ہو گا ___ یہ تو چھری نے کہا تھا کہ میں بھی ہوں۔

ملزم بولتے کیوں نہیں ۔ ؟

جو ملزم ہو گا ، بولے گا ۔

اس لئے عدالت اسے سزائے موت کا حکم ___ سیاہ آسیٹن کے منہ میں

میرا سر ہے ۔ اور میں چپ ہوں ۔

یہ دنیا کس کے گیت گا رہی ہے ___ مجھے گیت نہیں چاہئیں ___ دنبہ

لاؤ ___ ماں : نہ کہاں ہے ___ مجھے چھوڑ دو ___ مجھے چھوڑ دو

اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی ۔

شاباش — شاباش — اسی طرح سکون سے مسکراتے ہوئے — خاکروب مسکرایا۔

میں مرنا نہیں چاہتا — خدا کے لئے مجھے بچاؤ — میں نے قتل نہیں کیا — وہ تو سایہ تھا — سایہ

" تمہاری آخری خواہش ؟ "

میری آخری خواہش ؟ — آسمان سے میری آنکھیں اتار لاؤ — مجھے روشنی چاہیئے۔

" ٹھیک ہے — ڈاکٹر نے نبض دیکھی۔ —

" میری آخری خواہش، مجھے میرا وجود دکھاؤ — میرے ہاتھ کی چھری کے نیچے سے میری گردن نکال لو — مجھے نہ مارو — میری آنکھیں بھنور میں اتر رہی ہیں — مجھے بچاؤ۔

شاباش غازی — خاکروب کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی — کلمہ پڑھو۔

" میری آخری خواہش ؟ " — اس نے اپنے آپ کو اپنے سے چھڑانے کی پھر کوشش کی۔

شاباش شہید — مسکراؤ — خاکروب کا دل چیخا —

" میری آخری خواہش ؟ " — اس نے چیخ کر کہا — یہ پھندا فوراً میرے گلے میں ڈال دو — ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

آسمان کے بھنور میں اترتی آنکھوں کے تاگے تڑتڑ ٹوٹ گئے

اور آسمان کی تہہ سے کھلتی آنکھوں نے دیکھا۔

پہرے دار اس کوٹھری کے آہنی دروازے کا تالا کھڑکا کے دیکھ رہا ہے کہ لگ گیا ہے یا نہیں ۔۔۔ لگ گیا ہے ۔۔۔ سورج پر تالے کی ضربیں پڑیں اور آہنی سورج کے درمیان گول آنکھ کے اندر ایک اور آنکھ آ کے تاریک ہو گئی۔

چوراہا
افسانے
انور سجاد

مرگی

جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔

اس نے آنکھیں مل کر کرلوں کے ننگے آئینے میں چاروں اور دیکھا۔ پھیلی ہوئی پتلیوں میں شیشے کی کرچیاں تھیں۔ اس کی نظریں سمندر کے چکنے کنارے پر بھاگتے ہوئے کیکڑوں کے پیروں میں الجھ الجھ کر ٹوٹنے لگیں تو مجھے پھر دورہ پڑا تھا؟ —— اس نے اپنے ٹوٹتے ہوئے جسم کو کانپتے، گھٹنوں پر سیدھا کرنے کی کوشش کی —— کیا ہوا تھا؟

میں ٹرام میں بیٹھا تھا۔ ٹرام کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ پتہ چلا کہ کوئی ٹرام کے نیچے آ گیا ہے۔ ٹرام رک گئی تھی۔ چند ایک متجسس لوگوں کی گردنیں ٹرام کی کھڑکیوں کے باہر جھانک رہی تھیں۔ کیا ہوا ہے —— ٹرام کے سارے مسافر

نیچے اتر گئے تھے۔ اور تیز تیز قدموں سے بس شاپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سڑک کے درمیان میں ٹرام کی پٹریوں پر ٹریفک رک گئی تھی۔ ساتھ والی پٹری پر مخالف سمت میں جانے والی ٹرام دندناتی ہوئی گزری، رکشا بسوں، موٹروں کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف آجا رہے تھے۔ ٹرام خالی ہو گئی تھی۔ کیا مصیبت ہے، پہلے ہی دفتر سے دیر ہو گئی ہے اب جانے بس میں جگہ بھی ملتی ہے یا نہیں۔ میں ٹرام سے اتر کے آگے کو بڑھا تھا۔ اور میری نظریں غیر ارادی طور پر ٹرام کے پہیوں کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ ایک بہت خوبصورت لڑکی کچلی پڑی تھی۔ اس کا خون اس کی دلٹوئی سے بہتے دودھ میں پگڈنڈیاں بناتا سڑک اور پٹری کی دہلیز پر جم رہا تھا۔ فٹ پاتھ کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس کی چھاتیاں پھٹے ہوئے گریبان میں تڑخ گئی تھیں۔ پاس کنڈکٹر اور ڈرائیور کھڑے تھے اور ٹریفک کا ایک سپاہی، رکشا، موٹریں، بسیں۔ لوگ آجا رہے تھے۔ میں ایک لحظہ کے لئے بھی رکے بغیر سیدھا دفتر کو چل دیا تھا۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ بس کا انتظار کون کرتا۔ اور پھر جانے جگہ بھی ملتی یا نہ ——— نہیں اس واقعے کا اثر نہیں تھا۔

تو پھر ؟

دفتر میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ پرزے مشینوں میں ڈھل ڈھل کر نکل رہے تھے۔ میں نے بڑے اطمینان سے اپنی شفٹ کا دورہ لگایا تھا۔ اور کمرے میں آکر کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے چائے کے دوسرے دور میں پورا اخبار پڑھ لیا تھا اور تیسرے دور میں ناول کا ایک باب۔ یہ دن بھی

دوسرے دن جی کی کاربن کاپی تھی تو آج پھر یہ دورہ کیوں پڑا ۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا خوش بھی تھا ۔ مالک نے میرے کام سے خوش ہو کر میری تنخواہ میں اضافے کا وعدہ بھی کیا تھا جس سے میری شادی کے امکانات روشن ہو گئے تھے آئندہ سال میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ اپنے کسی رشتہ دار سے کہہ کہلوا کر شادی کا بندوبست کرا سکوں پھر میں پوری طرح سٹیبل ہو جاؤں گا ۔ لاوارث ہونے کی حیثیت سے میرے رشتہ دار میری بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے اور مجھے اس سے بھی کبھی کوفت نہیں ہوتی تھی ۔ لیکن پھر کبھی کبھی مجھے یہ کیا ہو جاتا ہے ۔

اس نے قریب سے بھاگتے ہوئے چھوٹے سے کیکڑے کو مار کر ریت میں گاڑ دیا ۔ اس کے جسم میں کمانیں ٹوٹ رہی تھیں ۔

"کیوں ؟"

اچھا بھلا دن گزر رہا ہوتا تھا ۔ بیٹھے بیٹھے یکدم اسے جانے کیا ہو جاتا کہ ہتھیلیوں میں زلزلہ آ جاتا ۔ اس کی آنکھیں ساری کائنات کے ملبے میں ڈوب جاتیں جب اس کا احساس لوٹتا تو وہ ٹکڑوں کی انی پہ تڑپ رہا ہوتا ۔

وہ گرتا پڑتا اٹھ کھڑا ہوا اور سمندر کے کنارے بھاگنے لگا ۔ پیروں میں پڑتی سمندر کی زنجیریں توڑتا ہوا ، ہانپتا ہوا ۔ اس کا جی چاہا کہ بہت زور سے چیخے ۔ اس نے چیخ ماری ۔ آواز سمندر کی گونجتی چپ میں ڈوب گئی ۔

وہ ہنستا رہیں ہنستا تھا ؟)

ننھی منھی تارا مچھلیوں اور گھونگھوں نے پکٹ پہن لئے ۔ پانی کی چنگھاڑتی ڈانٹ چٹانوں کو پھکار سے اڑاتی سمندر سے اٹھی اور اس کے جسم میں روئی کے

دانت گاڑ کے بلبلوں میں پھوٹ بہی۔۔ وہ بھاگتا بھاگتا رک گیا اور غصے میں
بلبلوں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ تم چپ کیوں ہو ؟

ڈائن پھر اٹھی، اور بانہوں کی پھانسی لیے اس کی طرف بڑھی۔ اس کا سانس
چھین کر اسے گیلی ریت میں اچھال دیا۔ مجھے چوٹ نہیں لگی۔ کوئی زخم نہیں آیا کیوں؟
اس نے مڑ کر سمندر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طلسم تھا۔ بے بسی تھی۔

دیکھا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وہ مجھ میں نہیں سمندر میں ہے۔
میرے اردگرد ہے۔ میں اس کے اندر ہوں۔ اس نے ہوا سے سانس چھینے
اور مٹھی بھر کے مٹی اپنے جسم پر مل لی۔ یہ میرا زخم ہے، یہ زخم پھیل کر میرا جسم بن
گیا ہے۔ یہ زخم بے حس ہے۔ اس میں کوئی جلن نہیں (جلن کیوں نہیں ؟) اس نے
آسمان کو گھورا، پھیکے سے آسمان میں پرانے زخموں کی سڑاند بھی (یہ بو مجھے
آ رہی ہے ؟)

اس کے پیر پر سنہری چیونٹی نے کاٹا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ یہ تو میرا پیر ہے۔ اس
نے جھک کر چیونٹی کو وہیں مسل دیا۔ پھر دوسری چیونٹی پھر تیسری۔ اس کے مسام
میں برچھیاں کھبی ہوئی تھیں (میرے جسم کے تمام رستے کب ڈھیلے پڑیں گے ؟)

دور سے آواز آئی (ہوا کی سرسراہٹ ؟ — درختوں کی سرگوشی ؟
سانپ کی پھنکار ؟ — پرندے کی سیٹی ؟) یہ آواز کیسی ہے ؟ مجھے آواز
آئی تھی۔ اس نے ہوا نگل کر کانوں کے پردوں کو سرکایا۔ سر ا — یہ تو ہوا
اپنے کاندھے پر سُر کو بٹھا کے لائی ہے۔ اس کے کئی رستے ڈھیلے پڑ گئے سُروں
نے اس کے کانوں کے پردوں پر ایڑیاں ماریں۔ جیسے چوٹ ہے اور اس کا صدا

تناؤ گھل گیا۔ مجھے اس گیت کی آواز آرہی ہے۔ میں یہ آواز اس لیے سن رہا ہوں کہ میں بھی آواز کے سمندر کی ایک لہر ہوں۔ وہ چٹان کی اوٹ میں ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی ریتیلی مٹی پر سیدھا لیٹ گیا۔ بھیگی مٹی کا لمس اس کے ہر خلیے میں سرایت کرنے لگا۔ ہر ہنستی کھیلتی لہر دوسری لہر کو پھلانگتی۔ چٹان سے ٹکراتی۔ پھوار اس پر آکے پڑتی (لہر کا خون) میں بھی کیوں نہ تھوڑا سا خون بہا لوں تاکہ شریانوں میں لہو کے بجائے اچھی طرح خلا رچ جائے، لیکن اس کا جی اٹھنے کو نہیں چاہا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور موت کے سکوت میں پہلا قدم رکھ دیا۔

(تم اپنا علاج کراؤ۔ تم ایسا قابل اور محنتی لڑکا، . . .)

(ہوں۔)

کئی دفعہ دھوپ آسمان سے اتر کے اونچی اونچی عمارتوں کی سب سے آخری اینٹ سے پھسلی تھی۔ اس کے حلق میں ٹپکی تھی اور دھوپ کا کانٹا اس کے تالو میں اٹکا تھا جس وقت اس کانٹے کی ڈوری ہلتی تھی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ خود ہے تو سہی۔ لیکن دھاگے کی جڑیں کہاں ہیں (کانٹا تو پھل ہے) دھاگا۔ جڑیں، دھوپ، عمارتیں، مشینیں، پرزے۔ لفظ، الفاظ۔۔۔ سیاہ الفاظ جو سفید کاغذ پر آگے سفید ہو گئے تھے۔ سفید الفاظ جو سیاہ بلیک بورڈ پر اتر کے سیاہ ہو گئے تھے اپنا مطلب گنوا گئے تھے۔ اور لفظوں، ناموں کے ساتھ تمام چیزوں کا مقصد بھی، لوگوں نے حوالوں سے چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ جاننا چاہا۔ لیکن سوچ کے لاوے کلبل کرتے رہے۔ انہیں پر نکلے۔

"تم میں اچھی خاصی تخلیقی صلاحیتیں ہیں۔ اگر ذرا توجہ کرو تو تمہیں چیزوں کے ذہن اور

لاروؤں کی کرکراہٹ، ان کے ہلنے کی سرسر ــــ مجھے خوف آتا ہے۔ تو میں بھی ہوں جو کبھی اس گراری کے دانت میں آتا ہوں، اور نہ کبھی اس میں، نہیں، یہ دانت تو نہیں۔ یہ تو موت کے سکوت کی مسلسل داب ہے۔ جو لمحوں میں منقسم ہے

(بدر میں بالکل ٹھیک ہوں مگر، بس یہ کبھی کبھی ذرا سا)

نہیں یہ سب کچھ، کچھ نہیں ہے۔

اس کے سن چہرے پر حرارت کے چٹاخ پڑ گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے روزنوں سے دیکھا۔ چٹان کا سایہ، آسمان کی چھت، دور پام، اور کھجور کے درخت۔ ان کے قدموں میں آک کے پودے۔ پودوں کے قریب جھونپڑوں کی چھتیں (اور دور افق پر عمارتوں کی چوٹیاں، مسجدوں کے گرجوں کے کلس) دھاگے کی جڑیں۔ (یہ مجھے پھر کیوں یاد آگیئں، اوہ، کسی نے ڈوری ہلائی ہے اور کانٹا ــــ اجڑیں کہاں ہیں؟) یہ سب موجود ہیں اور ریت میں ذرّہ۔ یہ سب مجھ پر چھائے ہوئے ہیں۔ نہیں سب کچھ، کچھ نہیں ہے (صرف میں ہوں!؟) کسی نے پھر مجھے چھوا ہے۔

(۶)

اس نے کراہ کے آنکھیں موند لیں (میں نے زندگی میں کسی چیز کی بھی کمی محسوس نہیں کی۔ میری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے۔ میں نے دنیا میں اتر کے دیکھا ہے ہر متحرک چیز کے ساتھ قدم ملا کر چلا ہوں، وقت تک کے ساتھ دوڑا ہوں، پھر یہ سب کچھ میرے ریشوں میں آکے یکدم رک جاتا ہے!)

کسی نے پھر اس کے چہرے کو ہلایا۔

"آنکھیں کھولئے نا"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر یکدم بند کر لیں (اور آنکھوں میں رنگ اچھلتا ہوا، عکس اور احساس بھی)

"آپ کو کیا ہو گیا تھا ؟"

نہیں نہیں

"آپ چٹان سے ٹکرا گئے تھے۔"

نہیں

"آپ آنکھیں کیوں نہیں کھولتے" (بار یک سی روہانسی آواز)

مجھے آواز واقعی سنائی دی ہے۔ مجھے واقعی کسی نے چھوا ہے۔ مجھے واقعی سینٹ کی خوشبو آرہی ہے۔ میری آنکھوں میں اس کا عکس بھی ہے (

"اف" ——— میرے جسم سے یہ درد کبھی نکلا بھی تھا؟ وہ کہنیوں کے سہارے بیٹھ گیا ———

"آپ بیہوش ہو گئے تھے۔"

اس نے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے۔

"ہم پکنک منانے آئے ہیں ——— اس نے دور جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں گراموفون ریکارڈ اب بھی بج رہے تھے ——— میں سیر کرتی ادھر آنکلی تھی۔

"آپ۔ آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ ؟"

"اف" ——— اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"آپ کچھ بتائیں تو۔۔۔۔"

"مجھے سمندر ____"

"اگر میڈیکل ایڈ کی ضرورت ہو تو ____"

(____کی بامنوں نے بھینچ دیا تھا۔)

میموں کی طرح کٹے بال۔ کالی ساڑھی، بغیر بازو، اور گہرے چاک کے گریبان والا سرخ بلاؤز۔ بغلوں کے بالوں میں اٹکے ہوئے پسینے کے قطرے گریبان کی اوٹ سے جھانکتی۔ دودھیا چھاتیوں پر پھسلتی نظروں کی زبان پر کانٹے پڑ گئے۔ اس نے تھوک نگلی۔ زندگی کتنی مہمل۔ کتنی بے کار اور کتنی پیاسی ہے، اس کی چھاتیوں میں ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا عکس ہے۔ ہوا میں لہراتا سیاہ ساڑھی کا پلو ناگ کا سر ہے۔ لڑکی نے اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے ساڑھی کو سینے پر جھٹک سے جمانے کی کوشش کی۔ ریت پر کالا ناگ بل کھا رہا ہے۔ اس کے منہ سے سرسبز ڈالی جھانک رہی ہے۔ جس پر پھل لگا ہے۔ (مجھے بھوک لگی ہے۔)

لڑکی اس کی بے معنی نگاہوں میں معنی پا کر رہ سی گئی۔

"یہ دیکھئے نا۔ آپ کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے کتنے ہی کیکڑے،"

(اچھا تو یہ کیکڑے ہیں)

لڑکی نے پاس پڑی خشک ٹہنی اٹھائی اور کیکڑوں کو بھگا دیا۔ کیکڑے ساتھ والے بل میں گھس گئے۔ (یہ مجھے نوچنا چاہتے تھے؟)

"آپ یہاں تنہا ہی آئے ہیں یا آپ کے دوست وغیرہ"

تنہا — آپ — دوست — ساتھ وغیرہ؟ — تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ

آوازوں کے جو مختلف نمونے تمہارے منہ سے نکل رہے ہیں۔ یہ کیا ہیں ؟
ان کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے ؟ ــــ میرے سارے رشتے گم ہو گئے ہیں۔
میں کس چیز میں اپنا عکس دیکھوں ؟ سڑک اور پٹڑی کے سنگم پر ہو ملا دودھ ہے
سانپ کے منہ میں پھل ہے۔ اور پھل کے اندر زہر ــ مجھے بھوک لگی ہے۔
لڑکی نے اسے سوچتے ہوئے دیکھا۔ "آپ ہوش میں آگئے ہیں۔ اب
میں چلتی ہوں

اس کا گوشت کٹی جگہ سے پھڑکا۔ اور پھر تن گیا۔

" آپ کو یقین ہے کہ اب آپ کو کسی مدد کی ضرورت نہیں ؟ "

یہ، یہ آواز کیسی آرہی ہے ؟ چرچخ، چراخ، کھٹا کھٹ، ٹھکاٹک، چرخ
چراخ۔ ہزنوا ابھی ابھی اس لڑکی نے کچھ کہا تھا۔ ــــ

وہ اٹھی، کالے ناگ کا سر ہوا میں جھوما۔ ا ــ ا ــ آ سانپ مسکایا۔ لڑکی
نے اسے اٹھانے کے لئے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اپنے اکڑے
ہوئے ہاتھ سے لڑکی کا ہاتھ پکڑا ــــ یہ ــــ یہ لوہے کا ٹکڑا کہاں سے آ
گیا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ چرچخ چراخ،
چرچخ چراخ، ہزار پور، کے دانت ــــ اور ان میں چمکتا ہوا موبل آئیل۔ یکدم
اس کا جسم کانپنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں ماتھے کے پیچھے چلی گئیں۔ اس کے
پیٹ میں خلا بھر کے اس کے وجود پر چھا گیا۔ تم کہاں ہو ؟ ــــ میرے اندر پھر
بھونچال آگیا ہے ــــ یہ دورے میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ میرے درد
کی کینچلی اتار دو ــــ تم کہاں چلی گئیں۔ ــــ میں سمندر کی تہ میں جا کر سیپ کا

کا منہ کھولنا چاہتا ہوں، اس نے اپنی آنکھیں مل کر سامنے دیکھا ــــ لوہے کے بازو اس کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھے تھے، شیشے کی گول گول چمکتی آنکھیں، تمام جسم جامد۔ میں نے تو نرم نرم ہاتھ چھوئے تھے۔ یہ پسٹن کہاں سے آگئے۔؟ مشینوں کی آوازیں پہلے آئی تھیں۔ وہ لڑکی کہاں گئی، اوہ، ہاں، یہ اس کا گریبان ہے۔ اس کی انگلیاں گریبان کی بھول بھلیاں سے ٹکرائیں انگلیوں نظروں نے محسوس کیا۔ سفید سفید، نرم نرم دودھیا چھاتیاں۔ باقی سارا جسم سرمئی سرد۔ لوہا اس کے سر میں سمندر کی لہر آکے ٹوٹی۔ اس نے خاردار زبان اپنے خشک ہونٹوں پر پھیری۔ اس کے کانوں میں لاتعداد کارخانے چل رہے تھے۔ اس نے اپنی کلائی کے آگے لگے پنجے کو گریبان کی طرف بڑھتے دیکھا۔

چیخ۔

لوہے کے پیالے آپس میں ٹکرائے۔ نرم نرم گوشت کہاں گیا؟ اس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ یہ آج میرے ہاتھ کو کیا ہوا؟ ـــ میں نے تو اس کی خواہش نہیں کی تھی۔ پھر یہ اکڑا ہوا پنجہ!!) اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے سامنے گھورا۔

"پاگل"

اس نے فوراً اٹھ کر پاس سے گزرتے ہوئے سیاہ کپڑے کو پنجے میں بھینچ لیا۔ ساڑھی کا پلو پھٹ گیا، اس کے ہاتھ میں لوہے کا سینڈل تھا۔ تو یہ ناگ کا سر نہیں ہے! ــــ میری کینچلی کا شکنجہ اور بھی کسا گیا ہے۔

اس نے پیر کو بے بسی سے بڑے غصے میں زمین پر دے مارا اور گھٹنوں

پر گر کر جنون میں اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے گیلی زمین میں گڑھا کھودنے لگا۔

دیوانہ وار۔ ———

رفتہ رفتہ اس کے تنے ہوئے ریشے تھکاوٹ میں رچ گئے۔ وہ ہانپتا ہوا گڑھے میں جا پڑا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر پڑے تھکاوٹ کے غلاف کی اوٹ سے دیکھا کہ سمندر کے سانس منہ سے نکلتی جھاگ میں ٹوٹ رہے ہیں اور چٹان کے بل سے کئی کیکڑے نکل کر بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس نے کروٹ بدل کر گڑھے کے آغوش میں منہ چھپا لیا اور پوری قوت سے آنکھیں بھینچ لیں۔

چوراہا
افسانے
انور سجاد

صدا بہ صحرا

ان دی مڈل آف دی سٹی واز دی ڈیزرٹ

(ایلیو وزوریٹی)

"تاریکی کے عین وسط میں تاریکی تھی"

دو جمع چار چھ، اور منفی ایک سات

ہم بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔

وہ کونے میں بیٹھا دھوئیں کی رسی تھامے خلاؤں میں نابود تھا ؟

وہ اپنی ہتھیلیوں پر ٹھوڑیاں جمائے سوچ رہے تھے اور ہم جمع چار کے ہاتھوں سے ان کی سوچ پھسل پھسل جاتی تھی۔ پیادے گھوڑے رخ قلعے، وزیر، بادشاہوں کی ڈھال بنے۔ وہ اُن دیکھے احکام کے منتظر تھے۔

ہوں، اگر گھوڑا ڈھائی گھر چل کر بادشاہ کو شہہ دے تو رُخ کے
ہاتھوں مرتا ہے۔ تو پھر شہہ کہاں ہوئی۔؟

گھوڑا مر گیا۔ پیادہ آگے کرو ۔۔۔ "چلو سرکار" ۔۔۔

"بادشاہ کا حکم"

ہم تو مطیع ہیں۔ دونوں نے سوچا

"بادشاہ تو گونگا ہے"

ہم ہنس دیئے

"جب چاند چھپا اور سورج نکلا تو روشنیوں کی جگہ شہر نے لے
لی اور تاریکی کی جگہ صحرا نے۔"

منفی ایک ابھی دھوئیں کی رسی تھامے نابود تھا۔ ہم نے سگریٹ
سلگا دیئے۔ گھوڑا رخ کے ہاتھوں مارا گیا۔ رُخ کو فیل کھا گیا اور فیل کو
سیدھی چال چل چل کے پیادے کٹ کٹ کے ڈبے
میں گر رہے تھے۔ گھمسان کا رن پڑا ۔۔۔ ہمارے رونگٹے کھڑے
ہو گئے ۔۔۔ اتنی خونریزی۔ ۔۔۔

"تم تو چانکیہ ہو" جمع ایک کو جب کچھ نہ سوجھا تو اس نے کہا۔
"وہ کون تھا؟ ۔۔۔ اس نے کیا کیا تھا؟
جو اس کھیل میں ہو رہا ہے۔
مہرے کٹ کٹ کے ڈبے میں گر رہے تھے۔ بساط پر انتشار تھا
ہم شور مچا رہے تھے۔

شہر کے عین وسط میں صحرا تھا۔"

بادشاہ سلامت، بادشاہ بچے ـــــ ہم نے تالیاں بجائیں۔

بادشاہ آمنے سامنے تھے۔

"بہت بڑا صحرا؟"

"ہاں ـــــ اتنا ـــــ بڑا ـــــ چھپکلیاں ـــــ گوہیں ـــــ گدھ ڈھانچے ـــــ!"

سچ مچ کا ویرانہ ـــــ شہر کے عین درمیان۔

"اور وہاں ـــــ ایک عورت کا ڈھانچہ بھی تھا۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔"

"تم نے کیسے جانا کہ وہ عورت تھی۔"

منفی ایک کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ "میں نے اس کی چھاتیوں سے دودھ پیا تھا۔"

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اوہ گاڈ تو سچ مچ کا صحرا ـــــ تم وہاں کیسے پہنچے تھے۔"

لہو کے دریا میں تیر کے

منفی ایک نوجوان کے چہرے پر جھریاں چھا گئیں۔ وہ سر کو ہاتھوں کے شکنجے میں کس کر بساط کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کہ جن میں چار جمع ہو تو کچھ نفی نہ تھے اپنی جگہوں پر تھم گئے۔ انھوں نے اسے شک کی نگاہوں سے دیکھا، وہ اپنا منہ نیچے کیے بڑبڑاتا رہا

" سائیں سائیں کرتے گھر ــ بنجر مسخ درخت ، فیکٹریوں اور فصلوں کے ڈھانچے ۔ "

" تم کس صحرا کی بات کر رہے ہو ؟ ــ اس کی ؟ ــ ہم جمع چار میں سے ایک نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی ۔

" زمین کا دل ایک ہی ہے ۔ "

منفی ایک کے سینے کا بلغم منہ میں آ گیا اور ہمارے پیروں میں شہر کا نقشہ کھنچ گیا ۔ ہم بساط چھوڑ کر شہر پر جھک گئے ۔

" کتنا خوبصورت صحرا ہے ۔ "

جمع دو نے مانگے کا سگریٹ سلگایا ۔ " ہمارے ہاں بھی ایک صحرا ہے ، سرسبز و شاداب جنگل کے وسط میں ۔ اس کے گرد دیوار ہے ــ نہیں گرد نہیں ــ آدھا دیوار کے اندر اور آدھا باہر ۔ " ــ

" وہ مارا "

جمع دو کی بات پر کسی نے غور نہ کیا ۔ ہم تیزی سے پلٹ کر پھر بساط پر آ گئے ۔ وہاں بادشاہ تھا نہ وزیر ، خلا تھا ۔ یہ کیا ہوا ۔ یہ کیا ہوا ۔

" میں اس دیوار میں ڈائنامیٹ لگا آیا تھا ۔ "

" شکر ہے ہم بچ گئے ۔ "

" ہم بچ گئے ۔ ہم بچ گئے ۔ ؟

" یہ کھیل کی ازلی تکنیک ہے ۔ " منفی ایک نے سر اٹھایا ۔

ہوا چوک میں آ کر پھانسی پر چڑھ گئی ۔

"وہ دونوں کھلاڑی کہاں گئے ۔؟" ہم میں سے جانے کس نے پوچھا۔

"تم سنتے نہیں میں کیا بک رہا ہوں ۔ وہ کونے سے چیخا۔

ہم چونکے، منفی ایک کی طرف دیکھا کئے۔ ہم سمجھے وہ نابود تھا۔

بادشاہ بچے، بادشاہ بچے۔ بادشاہ کے سر پر تاج نہیں پر بادشاہ ہے۔ ہم نے پھر بساط پر سر جھکا دیئے۔

"تم نے سنا نہیں میں کیا بک رہا ہوں۔"

"تم کیا بک رہے ہو۔"

"میں تاریخ کی کاربن کاپی چاٹ رہا ہوں۔"

ہمیں بے اختیار ہنسی آگئی۔ —— "تو چاٹتے جاؤ —— چلو جی تم چال چلو —— اور —— "

اور چابکیہ یہ آج کی ڈیکیٹیشن ہے۔

"شہر کے دروازوں سے ہوا داخل ہوتی تھی، گلیوں، بازاروں میں پھرتی تھی۔ اور چوک میں آکر پھانسی پر چڑھ جاتی تھی۔"

نہ چاہنے کے باوجود ہمارے کانوں نے الفاظ وصول کئے۔ اور دماغ تک پہنچا دیئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور دھوئیں کی ڈوری کا سرا ڈھونڈنے لگے۔

"کیا کہا تم نے پھانسی پر چڑھ جاتی تھی۔؟"

"ہوا؟"

"ہاں۔"

ہم بے اختیار ہنسے — بیوقوف —

ہمیں شطرنج کھیلنے دو — میاں اتنا سوچو نہیں، ورنہ میدان خالی کر دو۔

کس کے لئے؟

ہمارے حلق میں ہنسی کہیں اٹک نہ سکی۔ "شہر کے عین وسط میں صحرا تھا۔"

"صحرا تھا؟"

"ہاں" — وہ دھوئیں کی ڈوری تھامے اٹھا، آہستہ آہستہ چلتا ہمارے پاس آگیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ وہ نہیں تھا۔ اس نے کش لے کر انگلی سے تمباکو کا ذرّہ زبان سے ہٹایا۔ اس کی زبان پر نارنج کی کاربن کاپی کی سیاہی تھی۔ — ہم سہم گئے۔

"ہوں" — اس نے بساط کو غور سے دیکھا۔ بادشاہ آمنے سامنے تھے۔ ڈبہ لاشوں سے پُر تھا۔

چالیجیے۔

"عین وسط میں صحرا تھا؟"

جھاڑیاں، ریت ہی ریت۔ ذرّوں سے کٹی زبانیں چپکی تھیں۔"

"رات کو —؟" ہم میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"رات کو تارے نہیں نکلتے تھے۔" — وہ ہمیں خوفزدہ کرنے میں

کامیاب ہو رہا تھا۔

"اور گدھے ؟"

"ہاں گدھے بھی تھے۔"

کہاں گئے، کہاں گئے۔

صحراؤں میں صحرا —— خلاؤں میں خلا ——

منفی ایک پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ہنسا —— "یہ آج کی (DICTATION) ہے" —— ہنستے ہنستے اس نے ڈبہ الٹا کر رکھ دیا۔ وہ تینوں دھڑا دھڑ زمین پر پھیلے شہر میں گریں۔

اس نے ڈبہ پیٹھ پیچھے چھپا لیا —— چیخا —— "تم نے اس ڈھانچے کی چھاتیاں چوسی ہیں —— ؟" تم نے، تم نے، تم نے —— ؟"

ہماری آنکھوں میں سانپ کی آنکھیں تھیں۔ نہیں نہیں نہیں نہیں۔

صحرا کی اذیت

منفی ایک مسکرایا —— ہماری نظروں کو اپنی آنکھوں کے شکنجے میں کس کر اس نے پیٹھ پیچھے چھپایا ڈبہ نکالا۔

"تم سب —— اپنی اپنی انگلی —— اس —— ڈبے —— پہ رکھو ——"

ہم نے رکھ دیں۔

اس نے ہماری انگلیوں سمیت ڈبہ سر پہ رکھ لیا۔ —— ہم نے انگلیاں ہٹا لیں۔

اس نے گھٹنوں تک جھک کر ہمارا شکریہ ادا کیا —— بساط ٹکڑے ٹکڑے کر دی —— اور بادشاہوں، وزیروں، قلعوں۔ ہاتھیوں، گھوڑوں اور پیادوں کو روند ڈالا۔ اس نے ہماری طرف ایک ایک کر کے دیکھا اور سینہ پھلا کر اطمینان کا سانس لیا —— اطمینان کا سانس ہوا میں تحلیل ہوتے ہی ہمارے ہاتھ اپنی گردنوں کی طرف اٹھ گئے ہمارے گلے میں دھوئیں کی رسی تھی —— ہمارا سانس رُکنے لگا۔

ہوا ہوا ہوا۔

منفی ایک کے قہقہے نرخروں میں چبھ رہے تھے ننھے ہوا سانس ہوا سانس۔

جب ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم اپنے گلے میں پڑی دھوئیں کی پھانسی کو کیسے کاٹیں۔ تو ہم نے چوک میں سسکتی سسکتی ہوا کو تھاما، تیز کیا اور منفی ایک پہ پل پڑے۔

چابکیہ

ہم نے چاروں اور دیکھا۔

آج کا خوبصورت صحرا۔

ہم نے دھوبیں کی ڈوریاں اپنے اپنے گلوں سے اتار کے تھام لیں اور صحرا میں نکل گئے۔
ہم چھاتیوں والی کی تلاش میں ہیں۔

چوراہا
افسانے
انور سجاد

سب سے پرانی کہانی

تیز ہوا اور بارش، طوفان۔

رات بہت تاریک تھی۔ زمین اور آسمان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک سیاہ چادر تھی جو کہ آسمان بھی تھا اور زمین بھی۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تو چادر پر پھڑپھڑاتے ہوئے گیلے سیاہ درخت ذرا واضح ہو جاتے۔ وہ درختوں کے نیچے تاریک ہی رہتا۔ روشنی پھر چادر میں جذب ہو جاتی اور پھر اور تھوڑی دوات سے ٹپکتی ہوئی سیاہی اور اس کے گرد لپٹا ہوا سیاہ کفن۔

یہ بھی جیل ہے ..... اس نے ہانپتے ہوئے، درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تاریک قید خانے کا راستہ ڈھونڈنے لگا۔ ابھی تو راستہ میرے سامنے تھا۔ پھر بجلی چمکی، وہ چار قدم اور بھاگا۔ راستہ کدھر ہے؟ وہ پھر رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں بھی سامنے کا عکس تھا۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے۔ میں کدھر کو جا رہا تھا؟ یہ بجلی کیوں

نہیں چمکتی؟ ـــــ کہیں میں راستہ تو نہیں بھول گیا؟ ـــــ میں کس طرف کو جاؤں!
کہیں پھر سامنے جیل تو نہیں ہوگی۔ وہ کپکپا گیا ـــــ نہیں نہیں ـــــ میں جدھر
جارہا تھا، ادھر دور دور درخت بالکل ساتھ اور ایک بالکل الگ تھلگ
تھا۔ بجلی کیوں نہیں چمکتی۔

اب تک جیل میں حاضری ہو چکی ہوگی اور الارم بج چکا ہوگا۔ لیکن مجھے
اس جنگل میں کس طرح ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ اس تیز بارش میں وہ میرے قدموں کے
نشان کبھی نہیں پا سکیں گے۔ بجلی پھر چمکی۔ وہ اٹھ کر کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ اس کی نظریں
سامنے درختوں میں الجھ گئیں۔ سلاخیں ہی سلاخیں۔ میرا رخ غلط ہے۔ وہ درخت
بالکل ساتھ اور ایک بالکل الگ کس طرف ہیں؟ اس نے اپنا رخ فوراً دوسری
طرف کر لیا۔ مجھے کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ اگر بجلی چمکے تو فوراً بھاگ سکوں۔
اٹھتے اٹھتے وہ پھر لڑکھڑا کے بیٹھ گیا۔ میری ٹانگوں میں تو جان ہی نہیں۔ میں
کس طرح بھاگوں گا۔ وہ تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹانگیں دبانے لگا۔ اگر
میں ساری رات کسی محفوظ مقام پر نہ پہنچ سکا تو یہیں بیٹھے بیٹھے میرے گرد
پھر جیل ہوگی۔ پولیس کو اطلاع ہو چکی ہوگی اور وہ جیپوں میں بیٹھے تیز روشنی
میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ لیکن انہیں کیا پتہ میں کہاں ہوں۔
کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جس سے اس کا دل یکدم بیٹھ گیا۔ میں نے
جیل والی قمیص اور سویٹر کہاں اتار پھینکے تھے؟ اگر راستے میں کہیں
وہ چیزیں پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو پھر میں نہیں بچ سکتا۔ ممکن ہے انہوں
نے وہ کپڑے اٹھا لیئے ہوں اور سیٹیاں ـــــ دور سے موٹروں کی آوازیں
اور قریب ـــــ بہت قریب ـــــ گڑ گڑ ـــــ آنکھوں سے روشنی
چھین لینے والی روشنی ـــــ میرا کیا قصور ہے ـــــ میں نے کیا کیا ہے؟

تم —— ہا ہا ہا —— تم نے بھاگنے کی ناکام کوشش کی ہے ۔
قہقہے اور گرجے —— مجھے چھوڑ دو —— مجھے چھوڑ دو —— تم مجھے بلا وجہ
قید نہیں کر سکتے —— ہاتھ گردن کی طرف —— ہا ہا ہا —— قہقہے پھر
گرجے، اپنا آپ چھڑاتے ہوئے ۔ اس کی دونوں کہنیاں تنے کے ساتھ ٹکرائیں
بجلی چل کر بجھی —— بادل گرجا —— میں بھی کتنا بیوقوف ہوں —— وہ مسکرایا
لیکن اب مجھے یہاں نہیں بیٹھنا چاہیئے ۔ وہ درخت کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا
ہوا۔ اس نے اپنے جسم کو ہاتھوں سے ٹٹولا —— میں ہوں —— اسے پہلی بار
سردی محسوس ہوئی ۔ اس نے کپکپاتے ہوئے ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور دوسرا
پاجامہ نما نیکر کی جیب پر جس میں چیل کی ٹوپی میں بتی ۔ بیڑی اور ماچس پڑی تھی۔
اگر میں نے یہاں کھڑے ہو کر روشنی کا انتظار کیا تو وقت بھاگتا ہوا مجھ سے
آگے نکل جائے گا اور فاصلہ طے نہیں ہوگا ۔ درد میں ٹوٹتی ہوئی ٹانگیں اٹھتی
اٹھتی رہ گئیں ۔ اگر میں غلط سمت یہ چلا گیا تو ؟ —— جو ہوگا دیکھا جائے گا۔
مجھے رکنا نہیں چاہیئے ۔ کیوں کہ میری دوڑ وقت کے ساتھ ہے ۔ اگر میں جیت
گیا تو زندہ رہوں گا ۔ ورنہ وقت میرا یہ حق بھی چھین لے گا ۔

بھاگو —— اور تیز —— بہت تیز —— اس کا ذہن اور ٹانگیں ایک
دوسرے سے زیادہ تیز بھاگنے لگے ۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی ، لیکن اب
اسے اپنے راستے کے نشان کی کوئی پرواہ نہیں تھی ۔ وہ بھاگا جا رہا تھا۔ اپنے
دماغ سے تیز، دماغ اس سے تیز ۔ تاریکی میں سلاخوں سے ٹکرائے بغیر جیسے
وہ صدیوں سے اسی جنگل میں رہتا تھا ۔ زمین اس کے پیروں تلے سمٹ رہی تھی
مگر فاصلہ طے نہیں ہو رہا تھا ۔ وہ وقت سے آگے نکل جاتا —— لیکن وقت
کتنا نہیں تھا —— بھاگ کدھر جا رہا ہوں —— میں کس طرف نکل آیا ہوں ؟ یہ

کونسی جگہ ہے ؟ — اس نے بھاگتے بھاگتے نینوں طرف دیکھا - اتنی بارش کہاں ہوتی ہے ، اور وہ بھی کالا پانی — یہ لمبے لمبے درخت ، قطار در قطار جو سرو ہیں نہ چیل نہ پیپل نہ برگد — لمبی لمبی سلاخیں ہیں — جنگل ایسے ہوتے ہیں ؟ — کہیں نہیں پھر — نہیں ، میں تو بھاگ رہا ہوں - اس شہر سے اسی شہر میں ، اس ملک سے ، اسی ملک میں ، اسی زمین سے ، اسی زمین پہ بھاگ رہا ہوں - میری یہ دوڑ کب ختم ہو گی - وقت کب ختم ہوگا ؟ مجھے بھاگتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے ہیں ، تب بھی رات تھی ، اب بھی رات ہے - تب بھی بارش اتنی ہی شدت سے ہو رہی تھی کہ اب ، پانی تب بھی کالا تھا اور اب بھی ، یہ سب کچھ کیوں ختم نہیں ہوتا ؟ کہیں کوئی گاؤں نہیں آتا ، کوئی گھر نہیں جہاں میں چولھے کے پاس بیٹھ کر — آگ کا خیال آتے ہی ، اس کے جسم میں سرد لہر دوبارہ دوڑ گئی اور اس کے جسم پہ پھیلے بال بھی کھڑے ہو گئے - جہاں میں بیٹھ کر گرم گرم چائے پینے کے بعد بیڑی سلگا لوں اور میری ساری تھکاوٹ دھواں بن کر غائب ہو جائے - اس کی گرفت جیب پر اور بھی مضبوط ہو گئی - گرم گرم چائے کی ایک پیالی ، اس نے لرزتے ہاتھوں سے پیالی پکڑ لی اور اپنی آنکھوں کا سارا تشکر اس بچی پہ جو اب بھی آنکھوں میں انڈیل دیا - جس نے ایک ادھ سوال کرنے کے بعد اسے تسلی دی تھی کہ اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے ! ہاں جی ! آپ فکر نہ کریں - تھوڑی سی تھکاوٹ دور ہوتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا — اسی بارش میں — صبح تک میں شمالی سرحد پار کر لوں گا - پھر مجھے کوئی خطرہ نہیں ہو گا — جی بس — ایک پیالی اور بیٹی ! — میرے بوڑھے ہاتھوں میں طاقت نہیں — تو ہی ان کی ٹانگیں دبا دے ، تاکہ یہ جلدی جا سکیں ، وہ بہت شرمائی ہوئی اس کے پاس زمین پہ

بیٹھ گئی تھی اور ہمیشہ ہوئے اس کے پیر دبانے لگی تھی۔ اس نے اس لڑکی کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر بیڑی کا کش لگایا اور آنکھیں موند لیں۔ میں نئی دنیا میں آگیا ہوں ——— ٹھک ٹھک ٹھک ——— اس نے فوراً لڑکی کے ہاتھوں سے ٹانگیں چھڑالیں ——— اچھی بڑھیا گھبرائی ہوئی آئی۔ بیٹی انہیں کوٹھری والی کوٹھری میں توڑی کے اندر چھپا دو ——— ان لوگوں کو میں خود ہی سنبھال لوں گی ——— اٹھو اٹھو جلدی کرو ——— لڑکی نے بڑی اداس آنکھوں سے دیکھا اگر تم پکڑے گئے تو میں ——— تو میں ——— وہ اٹھ کھڑا ہوا، میں تمہیں کبھی بھول نہ سکوں گا ——— ہا ہا ہنستے ——— دروازہ ٹوٹ گیا ——— میں تمہارے شہر میں نہیں ——— وہ پیچھے ہٹا ——— مجھے چھوڑ دو ——— میں تو اس زمین پر ہوں، جس کا کوئی نام نہیں ——— شمالی سرحد کے پار ——— وہ اور پیچھے ہٹا ——— تم مجھے نہیں پکڑ سکتے ——— پہلے ——— پہلے ان سے ———

اس نے ادھر ادھر دیکھا ——— وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹا۔ اس کا پیر زمین پر جھاڑیوں میں الجھ گیا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر جا پڑا بڑے زور کا دھماکا ہوا اور ساری دنیا روشن ہو گئی ——— اس نے سر اٹھا کے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ——— وہ سامنے ——— وہ سامنے ایک مکان! اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ جنگل میں؟ ——— ہاں ——— اچھی بڑھیا کا گھر، اس کی بیٹی کا گھر ——— زندگی ——— زندگی ——— وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا میں صبح تک شمالی سرحد ضرور پار کر لوں گا۔

وہ مکان کے سامنے تھا۔ کافی دور ہٹ کر جلتا ہوا درخت بجھ رہا تھا جس پر بجلی گری تھی، گھر میں کوئی روشنی نہ تھی۔

کوئی ہے ——— ؟ بارش کے شور میں اسے خود اپنی آواز سنائی نہ دی اس

دروازہ کھٹکھٹایا۔

کوئی جواب نہیں۔

ساتھ والی دیوار میں کھڑکی کے پٹ زور سے بجے۔ ۔ ۔ وہ لپک کر وہاں پہنچا۔ کھڑکی کا ایک پٹ جس کا ایک قبضہ ٹوٹا ہوا تھا، پھٹے ہوئے بادبان کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"گھر میں کوئی ہے"، اس نے کھڑکی کے اندر سے جھانک کر پوچھا

دھڑاڑام گھر کی خستہ چھت یا دیوار نے جواب دیا، مگر چیخ بلند نہ ہوئی وہ کھڑکی کو پھاند کر اندر آگیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نیکر کی جیب سے ڈبی نکالی، ڈبی کچھ گیلی تھی۔ مجھے آگ کی بہت ضرورت ہے کہیں ماچس بھی گیلی نہ ہو گئی ہو۔ اس نے جلدی سے ماچس اور بیڑی نکال لیں اور منہ کی ہوا سے ڈبیا کو کچھ خشک کیا۔ کئی مرتبہ دیا سلائی رگڑنے کے بعد سلائی جل گئی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لینے کے بجائے اس شعلے سے ماچس کو اور خشک کیا۔ پھر اس نے کھڑکی بند کر کے اینٹ آگے رکھ دی اور دیا جلا کر اس کی روشنی میں کمرے دیکھنے لگا۔ پچھلے کمرے کی دیواریں گری ہوئی تھیں اور آدھی چھت بھی زمین پر پڑی تھی۔ باقی دو نوں کمروں کی دیواریں کونوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مکڑی کے جالوں سے بندھی تھیں۔ اس نے واپس اسی کمرے میں آ کے سوچا اگر یہ چھت گر بھی گئی تو تو کیا ہوا، واپس جانے سے بہتر ہے کہ یہیں دفن ہو جاؤں۔ اس نے فرش پر بکھرے ہوئے ناریل کے بال اکٹھے کئے جو غالباً صوفوں میں بھرتے وقت رہ گئے تھے یا پرانے صوفوں سے نکلے ہوئے تھے۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جو کہ غالباً باورچی خانہ تھا، چند ایک لکڑیوں کے علاوہ اور کہیں

کچھ نہیں تھا۔ اس نے یہ سب کچھ اسی کمرے کے ٹوٹے ہوئے آتشدان کے قریب جمع کر لیا اور آتشدان میں آگ جلا لی۔

دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے بیڑی سلگائی اور آنکھیں موند لیں۔

رات، بارش، ہوا اور بجلی ابھی تک ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔

اب میں بالکل محفوظ ہوں وہ مسکرایا۔ اس طرح زندہ رہا جاتا ہے۔ لیکن جانے شمالی سرحد ابھی کتنی دور ہے اور مجھے ابھی اور کتنا چلنا ہوگا۔ راتوں رات یہ سفر ختم ہو جاتا، تو اچھا تھا۔ دن میں سورج سے کیسے چھپ سکوں گا ——

مجھے چلنا ہی چاہیئے۔ اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی، ہاں، ورنہ پھر ڈیوڑھی میں دروازے کے پٹ زور سے بجے۔ اس نے گھبرا کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک سایہ لپکا، وہ دبے پاؤں ڈیوڑھی کی طرف آیا۔ سایہ دیوار پر چلتا ہوا ڈیوڑھی کی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

"کون ہے؟" —— اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

کوئی بھی تو نہیں وہ تو آگ کی وجہ سے میرا اپنا ہی سایہ تھا۔ یہ دروازہ کھلا تھا؟ —— ہوں! —— دوسرا پٹ کھلا ہی ہوگا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ کمرے میں لوٹتے ہوئے اس کے پیر دہلیز میں جم گئے۔

وہ دبے پاؤں فوراً دہلیز کی اوٹ میں ہو گیا۔ آگ کے پاس کوئی بیٹھا تھا۔ سر جھکائے شعلوں کو گھور رہا تھا —— یہ کون ہے؟ —— کہاں سے آیا ہے؟ وہ یہاں پہلے سے موجود تھا، یا اب آیا ہے۔ کہیں مجھے پکڑنے والوں میں سے

تو نہیں ؟ — اس کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے وردی تو نہیں پہن رکھی۔ اس کے کپڑے اتنے گیلے ہیں کہ پانی سے بنے معلوم ہوتے ہیں اور شکل — شکل — اس نے آنکھیں جھپکا کر پھر اس کے چہرے کو دیکھا چہرہ واضح نہیں تھا۔ وہ ابھی تک اسی طرح بے حس چپ چاپ بیٹھا تھا۔ میں کب تک یہاں کھڑا ٹھٹھرتا رہوں گا۔ میں نے آگ اس کے لئے نہیں جلائی تھی۔ جنگل ہے وہ یہیں رہتا ہو۔ لیکن اس نے میری دستک کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ شاید یہ بھی میری طرح — جو کوئی بھی ہو۔ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہوں۔ وہ چوکنا ہو کر دبے پاؤں چلتا ہوا بالکل اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے نے بالکل کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے دوسرے کی نظریں بچا کر زمین سے کرسی کا ٹوٹا ہوا بازو اٹھا لیا۔

"تم کون ہو ؟" — اس نے دوسرے کے نقش واضح دیکھنے کی کوشش کی۔

"جواب کیوں نہیں دیتے ؟"

دوسرے نے جھکا ہوا سر دھیرے دھیرے اٹھایا اور نظریں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں۔ اس کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی — دوسرے کی آنکھیں ناک گال، منہ اور کان ایک دوسرے میں گھلتے ملتے ابھر رہے تھے۔ بارش میں پڑی آبی رنگوں کی تصویر — کرسی کے بازو پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ دوسرے نے نظریں دوبارہ جھکا لیں۔

"نہیں سنائی نہیں دیتا۔ کون ہو تم ۔۔۔ ؟

" تم کون ہو ؟ " دوسرے نے جھنجھلا کر آگ سے کہا۔

تم یہ ان میں سے نہیں ہے۔ یہ مجھے جاننا ہی نہیں، ورنہ میں اب تک محصور ہو کر پکڑا گیا ہوتا ۔ میں اس جنگل کے رہنے والوں میں سے ایک ہوں" اس نے بے دھڑلک ہو کر کہا۔ دوسرا مسکرایا۔

" اور تم ؟ " اس نے دوسرے سے کہا۔

" میں کوئی نہیں۔"

" کیا مطلب " ؟

" میں سب کچھ ہوں۔"

" دیوانے ہو ۔۔۔ اب یہ مسکرایا ۔۔۔ " لیکن یہاں کیا کر رہے ہو ؟ "

دوسرا پھر سوچ کی آگ میں اتر گیا

" بتا دیتا "

دوسرے نے ہاتھ کے اشارے سے کہا " پتہ نہیں "

" ٹھیک ٹھیک بتاؤ ۔ ورنہ میں تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔"

" تو تم قاتل ہو " دوسرے نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ اس نے لکڑی ہوا میں اچھالی جیسے ابھی اس کے سر پر دے مارے گا۔ " تو پھر تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں "

" کیوں " ۔۔۔ ؟

" یہ ہاتھ والی لکڑی آگ میں ڈال دو۔ آنچ ہلکی ہو رہی ہے " ۔

"تم بھی معزور رہو۔"

"تمہارا چہرہ واضح کیوں نہیں"

"تمہاری نظر کمزور ہے"

"میں ہر چیز کو صاف دیکھ رہا ہوں"

"یہ بھی نظر کا دھوکا ہے۔ تم آئینہ دیکھو گے تو اپنے آپ کو بھی پہچان نہ پاؤ گے"

وہ جھینپ سا گیا۔ "میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ تم مجھے صاف دکھائی دے رہے ہو۔"

دوسرا ہنسا "یہ بھی فریب نظر ہے۔"

عجیب سی باتیں کر رہا ہے۔ کمبخت۔ مجھے ابھی اس قسم کی بے معنی باتوں میں تو نہیں لگائے رکھنا چاہتا۔ تاکہ پولیس کے آنے تک میں کچھ سوچ نہ سکوں اور پھر یکایک ——— تم پولیس سے تو نہیں ہو؟"

"اوہوں۔ مجھ پر تو خود مقدمہ چل رہا ہے۔"

مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑونگا"

"میں تو خود کسی چال کا شکار ہوں۔"

"ثبوت؟"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم معزور نہیں ہو۔؟"

"میری نیکر"

"اس قسم کا کپڑا اور کہیں نہیں ملتا؟"

پر جھینپ گیا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ وہ اس کے چہرے کے تاثر اور اس کی زبان پر اعتبار کرے۔ پھر اس نے سوچا کہ میں یہاں سے چلا ہی کیوں نہ جاؤں ۔۔۔ یہ اٹھنے لگا۔

"جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

بارش اسی طرح ہو رہی ہے اور اب تمہیں اس قسم کی اور کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

"تمہیں کس طرح پتہ ہے؟"

"ہوا کہاں نہیں جاتی" ۔۔۔ وہ مسکرایا۔ میں نے اپنے آپ کو جنگل میں پایا ہے۔ حیرت ہے، تم سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔"

"شاید اس لئے کہ میں گوشہ نشین ہوں۔"

"پھر صبح ہو جائے گی، میں چلتا ہوں۔"

"لیکن اس جنگل میں تو تاریکی ہی رہے گی ۔۔۔ اب ہمارا ساتھ شاید کبھی نہ چھوٹے۔ جہاں تم جاؤ گے میں بھی وہیں جاؤں گا۔"

"لیکن تم پر تو مقدمہ چل رہا ہے۔"

"جانے مقدمہ چل رہا ہے یا سزا بھگت رہا ہوں۔"

"تمہارا جرم کیا تھا؟"

"میرا؟" اس نے دیوار کے ساتھ پھر سے ٹیک لگالی۔

"اچھا اب چپ کرو اور مجھے سوچنے دو" دوسرا پھر آگ میں اُتر گیا۔

"میں نے زندہ رہنے کی کوشش کی تھی۔" اس نے آنکھیں موند لیں،
"کون نہیں کرتا۔ ہر جو ایک مرتبہ پیدا ہو جائے۔ زندگی اس کا حق ہے۔"
"ہم جس لمحے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لمحے مرنا شروع ہو جاتے ہیں۔"
"اور انسان اس عمل کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ بات بڑی معمولی سی تھی ——— میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ مجھے یہاں سے نفرت ہو گئی تھی (اور اب بھی ہے) اور میں یہاں چلا جانا چاہتا تھا۔ یہاں میں دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ میری کوئی قدر نہیں تھی۔ میرا دل پرواز کرنے کو چاہتا تھا۔ لیکن زمین کی دھول میرے پیر نہیں چھوڑتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میرا بھی ایک اپنا گھر ہو۔ لیکن میں چچا کے گھر ایک کابک میں قید تھا۔ میں ——— میں اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ جانے میرا گھر کیسا تھا۔ کہاں تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ——— میرے کانوں میں صرف ایک سریلی دھن کی بس گھلی تھی اور میں وہاں نہیں تھا ——— جانے میں نے کیا کیا تھا کہ مجھے آگ کے شعلے بھڑکے۔

مجھے یہاں کے ہر فرد سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس نے دوسری لکڑی اٹھا کر زمین پر ماری۔ اور زمین پر کوڑے کی طرح نشان پڑ گیا۔ ہر جگہ یہاں سے بہتر ہو گی۔ یہاں میں نے چیخ چیخ کر سب سے کہا تھا۔ کہ دیکھو میں ہوں۔ اور سب نے یہی کہا تھا کہ تم نہیں ہو۔ میں نے یقین دلایا تھا کہ میری ماں نے جنم دیا تھا۔ اور سب ہنستے تھے۔ میں نے کہا کہ میرا باپ تھا اور سب نے زور زور سے قہقہے لگائے تھے ——— اور تم تم میرے چچا ہو۔ سب سے اونچا قہقہہ

اسی کا تھا ــــ ہاں اور میں تمہارا ان داتا ہوں۔ تمہاری ماں کا بھی ان داتا تھا"
اچھے کہیں کے ــــ میری ماں اسی دکھ میں مر گئی تھی۔ اسے شاید مر ہی جانا
چاہیئے تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ مجھے ماں سے
بہت محبت تھی۔

آگ ہنسی ــــ ماں ــــ اور یہ ہنسی ــــ پہلے سب تاریکی ہے لیکن
یہ کچھ مانوس نہیں۔ اس اندھیرے میں اپنی ہی روشنی تھی۔ اور میں نے کوئی
جرم کیا تھا؟ ــــ شاید اس اندھیرے کی لو اونچی کرنا چاہتی تھی، دھن
کی بس کا اثر ہو جانے دیا تھا ــــ میں نے کیا کیا تھا۔ مجھ سے کونسی خطا سرزد
ہوئی تھی ــــ مجھے اپنی ماں سے نفرت ہے۔۔

مجھے پیسے چاہیئیں ــــ میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ پیسہ ہا ہا ہا۔
کہاں سے لو گے؟ ــــ میں کیوں نہیں کچھ کماتے ــــ یہاں کچھ نہیں ــــ
مزدوری کرو ــــ وہ تو میں کر ہی رہا ہوں ــــ مجھے روٹی کے علاوہ سب
کچھ چاہیئے۔ جو تمہارے پاس ہے، دوسری چیزوں پر میرا حق بھی ہے
کیوں کہ میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ مجھے بھی موقع دو مجھے بھی زندہ
رہنے دو۔ پیسے دو گے یا نہیں؟ چچا نے دکان سے لوٹتے ہی مجھے بڑی
غلیظ گالیاں دی تھیں۔ میں اس سے رقم والی تھیلی چھین رہا تھا۔ اس کے ہاتھ
میری گردن پر تھے ــــ زندگی میری ہے۔ میں نے تھیلی چھوڑ کر چاقو نکالا
اور اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ میرے سامنے تھیلی کے پاس زمین پر چچا تڑپ
رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا تھا۔ رقم بھری انگلیاں میرے

نہ ہیں تھیں ، پھر مجھے پتہ نہیں ہے کیا ہوا تھا ۔ چچی اور اس کے بچے بھاگے بھاگے آئے تھے ۔ میں تو تجیلی اٹھا کر اپنی ماں کی قبر پہ اسے خدا حافظ کہنے جا رہا تھا

ماں ۔۔۔ مدھم ہوتے ہوئے شعلوں پر کسی نے لکڑی رکھی ۔ یہ کو کھ نہیں ہے ، قبر ہنسی ۔ یہ کیا ہے ۔ کوکھ سے پہلے کیا تھا ۔ قبر کے بعد کیا ہے میں یہاں پہ کیوں ہوں ۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ۔

مجھے کچھ پتہ نہیں پھر کیا ہوا تھا ۔ میں نے سنا ہے کہ میں کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا ۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے ۔ کہ کٹہرا لکڑی کا نہیں تھا ۔ میرے ارد گرد ہڈیوں کا جنگلا تھا ۔ اور میرے ارد گرد گدھ ہی گدھ تھے سر جھکا کے ۔ عجیب سی باس فضا میں تھی ۔ دور کہیں سے جیسے افق سے آواز آئی تھی ۔ کہ میں نے جسے چاقو مارا تھا ۔ چونکہ وہ بچ گیا ہے ، اس لیے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر میرا قصور کیا ہے ۔

میرا قصور ؟

یہ زمین مجھے یہاں سے نہیں جانے دے گی میں بے بس سا ہو گیا تھا

" یہ زمین میری نہیں ہے "

اور میں دن رات یہ سوچتا تھا کہ اگر میرا کوئی قصور نہیں تو یہ سزا کس لیے ہے ؟ میں نے سب کی طرح زندگی اور اس سے متعلقہ چیزیں مانگی تھیں ۔ مجھے انکار کر دیا گیا ۔ میں نے اپنی چیز چھیننے کی کوشش کی تھی اور میں جیل میں تھا ، دوسرے قیدی بھی شاید اسی طرح سوچتے ہوں گے دن رات چار دیواری میں بند سر جھکائے ۔ ماں نے کہا تھا ۔ پتھر چیا نے چٹانوں کو کندھوں پر اٹھا کر آسمان پہ ۔ آسمان سے پھر زمین پر ۔ وہی پتھر دوبارہ زمین پر

پر پھر آسمان پر اور پھر زمین پر ——— میں پتھر نہیں چباؤں گا۔ چٹانیں نہیں اٹھاؤں گا۔ ان لوگوں کے دماغ سڑ گئے ہیں اور میرا دماغ ابھی تازہ ہے۔ میں آزاد پیدا ہوا تھا اور آزاد ہی رہوں گا۔ میں میخوں کے بستر پر نہیں لیٹوں گا ——— یہ جسم میرا ہے، میں اس کی حفاظت کروں گا۔

جسم کہاں ہے؟ ——— آگ کی لپٹیں اور بھی اونچی ہو گئی تھیں۔ پھر رات آئی بارش آئی۔ اور طوفان آیا اور میں اب بھی وہیں ہوں۔

میں وہاں نہیں ہوں

اور مجھے اب بھی پتہ نہیں چلا کہ میں نے کیا کیا ہے۔

ہوں، ——— وہاں سے نکل کر سب سے پہلے میں ماں کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ ——— لیکن وقت ———

ماں سے محبت ——— ؟

کیسے نہیں ہوتی۔

مجھے نفرت ہے۔ نہ وہ مجھے جنم دیتی اور نہ میں اس طرح سوال بنتا۔ میرا بس چلتا تو میں کوکھ ہی میں اسے مار دیتا۔

"کیا کہا ——— تم نے کیا کہا؟" ——— اس نے گھبرا کر دیوار سے آگے کو جھک کر کہا۔ دوسرا اسی طرح آگ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"ہوں؟"

"تم نے کچھ کہا تھا؟"

"کچھ نہیں، میں نے تو کچھ نہیں کہا۔"

"ابھی ابھی"

"یہ کس نے کہا تھا ـــــــ"

"کہ "

"خیر چھوڑو اسے ـــــــ میں تو سوچ رہا ہوں کہ یہ کس قسم کا مقدمہ ہے اگر سزا ہے تو کیسی ہے۔ اگر میں مجرم ہوں تو کیا الزام ہے۔ میں جہاں بھی ہوں وہاں کیوں ہوں ـــــــ میں واپس جانا چاہتا ہوں ـــــــ"

"کہاں ؟"

"جہاں سے آیا ہوں"

"تم میرے ساتھ چلو ـــ شمالی سرحد کے پار"

"جب میں نے تمہارے ساتھ چلنے کو کہا تھا تو تم گھبرا گئے تھے۔"

وہ مسکرایا ـ لیکن نہیں میں یہاں سے نہیں ہوں ـ یہاں سے کوئی راستہ نہیں جاتا اور میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں ؟"

"تاکہ میں جا کر پتہ کروں کہ جہاں میں تھا، وہ کیا تھا، میں وہاں کیوں تھا۔ اور میں یہاں کیوں تھا۔ ؟"

"کس سے پوچھو گے ؟"

"اپنے آپ سے"

"واقعی پاگل ہے، کوئی مقدمہ وغیرہ نہیں ہے، کسی پاگل خانے

سے بچا گیا ہوا ہے ۔ " پر تم وہاں جاؤ گے کیسے ؟ "

" دیکھو، بارش ختم ہو گئی ہے ؟ "

اس نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ دور افق پر سویرے کی روشنی تھی، آسمان صاف تھا۔ اس نے لمبا سانس لیا ۔ تم تو کہتے تھے یہ جگہ تاریک ہی رہے گی ۔ "

" ہے تو ۔۔۔۔ یہ روشنی جنگل سے دور ہی رہے گی ۔ " ۔۔۔۔

پیلا ہنسا ۔۔۔۔ " چلو چلیں " اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

" سامنے پہاڑی ہے نا ۔۔۔۔ یہی شمالی سرحد ہے ۔ "

" اچھا ۔۔۔۔ پھر تو ہم بہت نزدیک ہیں ۔ "

" لیکن چٹان بالکل سیدھی ہے، قدم نہیں پڑ سکتا ۔ "

" میں انتظام کر لوں گا "

" اس پر کوئی جھاڑی یا درخت نہیں "

" میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا ۔ "

" اور مجھے تنہا چھوڑ کے چلے جاؤ گے ۔۔۔۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا " دوسرا اگر جا۔

" کیا مطلب ہے تمہارا ؟ " ۔۔۔۔ پیلا کھڑکی سے گھوما ۔۔۔۔ " تم نے خود ہی کہا تھا۔ نہیں نہیں تم اپنے راستے جاؤ ۔ "

" دوسرا اتنے زور سے ہنسا کہ باقی کی چھتیں بھی گرتی گرتی رہ گئیں ۔

" میرا راستہ کاٹھ کے دروازے سے ہو کر جاتا ہے " وہ الماری طرح کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے کاٹھ کا دروازہ توڑ دینا چاہتا

ہو۔

"اگر یہی بات ہے تو میں تمہیں قتل ۔۔۔"

"میں مر نہیں سکتا" ۔۔۔ دوسرا پھر ہنسا ۔۔۔ "میرے کان نہیں آنکھیں نہیں ۔۔۔ مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ اور میں یوں بول بھی نہیں سکتا۔" پہلے نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسرے نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "میرے راستے میں کانچ کا ایک دروازہ ہے، جب تک وہ سایہ نہیں بن جاتا ۔ مجھے اپنے سوال کا جواب نہیں ملے گا۔۔۔ مجھے جواب چاہیے ۔۔۔ جلد بہت جلد ۔۔۔"

دوسرا اسی طرح چیختا ہوا آگ میں جا کھڑا ہوا۔ آگ اور بھی بھڑکنے لگی۔ دوسرا ہنسا ۔۔۔ بہت زور سے ۔۔۔ اور زور سے ۔۔۔ "دیکھو ۔۔۔ میں تب تک چل نہیں سکتا، جب تک ہر چیز سایہ نہیں بن جاتی ۔۔۔ میرے کپڑے تب تک گیلے ہی رہیں گے۔

"کو ۔۔۔ کو ۔۔۔ کون ہو تم ۔۔۔؟"

"ایک ۔۔۔ جو اپنا جرم جاننا چاہتا ہے" ۔۔۔ وہ آگ سے نکل کر اس کی طرف بڑھا۔ پہلا ملٹے پاؤں چلتا ہوا گھبرا کے تیزی میں کھڑکی پھاند کے باہر آ گیا اور دیوار کے ساتھ پڑی اینٹ اٹھالی۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا ہو گا۔ پہلا اینٹ پھینک کے بھاگنے لگا۔ شمال سرحد کی جانب ۔۔۔ میں نہیں مروں گا ۔۔۔ میں اتنی مشکل سے آزاد ہوا ہوں۔؟

"تم اب بھی قید ہو ۔۔۔ قریب ہی جیسے دوسرے کی آواز آئی ۔۔۔

اس کی اینٹ پر گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی اور یہ رک گیا پہلے اس سے نپٹ ہی لوں ۔ پھر اطمینان سے پہاڑی پر چڑھوں گا ۔۔۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا ۔۔۔ ابھی ابھی تو اس کی آواز آئی تھی ۔۔۔ کہاں ہو تم ۔۔۔۔ ؟

تم کہاں ہو ؟" دوسرے کی آواز بالکل اس کے کپڑوں کی طرح بھیگی ہوئی تھی اس نے چاروں اور دیکھتے ہوئے سوچا ۔ ابھی ابھی تو اس نے میرے سامنے کھڑکی پہچان لی تھی ۔ مجھے جلد از جلد اس کاٹھ کے دروازے کو ڈھونڈ لینا چاہئے ۔

پہلے نے خود کو تھپایا کے اینٹ پھینک دی اور چٹان پر چڑھنے لگا ۔ آہ ۔۔۔ مشکل مرحلہ ۔۔۔ اب وہ کم بخت مجھے کبھی نہیں پکڑ سکے گا ۔

ایک دو قدم چڑھنے کے بعد وہ پھر پھسل کے چٹان کے قدموں میں آ گیا ۔ پھر چڑھنے لگا ۔ پھر پھسلا ۔ اس نے اینٹ اٹھالی ۔ کہیں وہ پیچھے سے آ نہ لے ۔ جانے کہاں ہے ۔۔۔۔ ؟

کہاں چلے گئے ہو ۔۔۔ آؤ ۔۔۔ میں دروازہ پار کرنا چاہتا ہوں ۔ تمہاری مشکل بھی حل ہو جائے گی ۔" ۔۔۔ دوسرے نے دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے کہا ۔۔۔ پہلا اس کے بالکل آگے تھا ۔۔۔ کوئی نہ کوئی ایسی جگہ تو ہو گی جہاں سے اس پہاڑی پر چڑھا جا سکے ۔ وہ پاگلوں کی وادی میں چکر لگانے لگا ۔ کبھی دوسرا اس کے آگے ہو جاتا تھا ، کبھی وہ دوسرے کے آگے ۔

"مجھے راستہ دو ۔۔۔ کہاں ہو ؟"

"جانے کمبخت کہاں ہے؟"

دونوں وادی کے دائرے میں ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے تھے ایک دوسرے کے آگے پیچھے، پیچھے آگے۔۔۔۔ دائرے میں دور دور نیچے چٹانوں کے گول دائرے میں دو سائے یا دو وجود یا ایک سایہ ایک وجود یا دونوں کچھ نہیں ۔۔۔ صرف ہوا ۔۔۔ صرف لو ۔۔۔ آسمان پر منڈلاتی ہوئی گدھوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

وادی کے عین اوپر، اپنی آنکھوں کے بالکل سامنے گدھوں کو منڈلاتے دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اور یکدم پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گدھ، لاش ۔۔۔ اس نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر نیچے وادی میں نظر دوڑائی اور زمین پر پڑے کنکر کو وادی کے رُخ ٹھوکر مار کے سوچا یہ جگہ کچھ عجیب سی ہے۔ یہاں سیر کے لئے قطعی نہیں آنا چاہیئے۔

سازش

ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے، سارا سارا دن مٹی کی ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر گڑھوں میں ڈالتے رہے۔ ہم آزاد تھے، صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا تھا کہ ہم قید میں ہیں۔

ہم چھوٹے سے ٹیلے پر ستانے کے لئے بیٹھے تھے۔ ہوں، ہم نے سوچا، ہم نہر کھود رہے ہیں۔

ہوں!

ہم سورج کی آخری کرن تھامے بند لاری میں بیٹھے لوٹ رہے تھے اور اپنے جسم پر بھاگتی ہوئی نیلی پیلی سلاخوں کو دیکھ رہے تھے۔

روشنیاں۔

روشنیوں کے سیلاب میں نوجوان لڑکیاں نظر آئیں۔ لاری کی رفتار کم

ہو گئی۔ ہم نوجوان مسکرائے۔ بوڑھا سنجیدہ ہو گیا۔ تانگے میں پچھلی گدی پر بیٹھی لڑکیوں نے اپنے سینوں پر گرم گرم چادریں سرکا دیں۔ بوڑھا مسکرایا۔ ہم نے کہا ۔۔۔ "لڑکیاں"

ایک نے کہا ۔۔۔ "آہ ۔۔۔ بیبے ۔۔۔ یہ سب سالا ہوچ پوچ ہے۔ وہاں اپنا گھر ل یہاں کے شیش محل سے بہت اچھا تھا۔"

ہم نے سوچا۔ یہ ہنر مکمل کب ہو گی۔

"فیدی" تانگے کی پچھلی گدی پر ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔ ہم حیران رہ گئے۔ لاری تانگے سے آگے بڑھی۔ تانگہ میلوں پیچھے رہ گیا۔ ہم پھر روشنی کی لکیروں کا پیچھا کرنے لگے۔ ہم سب جانتے تھے کہ یہ لکیریں ہمیں کہاں لے جائیں گی۔ ۔۔۔ ہم نے سلاخوں سے دیکھا۔ ایک نے کہا۔ "میرا شہر" ۔۔۔ دوسرے نے آنکھیں بند کر لیں۔ "دل چاندنی چوک ۔۔۔ امیر سر ۔۔۔ نان قلچے، باقر خانیاں، ہال بازار، دربار صاحب ۔"

"سکھ وا پیٹر" تیسرے نے مجھ سے بڑی مانگ کر سلگائی۔ لاہور۔ لاہور اے۔ بھائی لوہاری، موچی۔"

بوڑھا مسکرایا ۔۔۔ "تم کہاں تھے۔"

"ہیں ؟" ۔۔۔ اس کی مونچھیں ننھی ننھی پھوٹی تھیں۔ ہیں ؟ میں کہاں ہوں ؟"

ہم سب ہنس پڑے۔ وہ جھینپ گیا اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا۔

"وہیں موہنجوڈارو میں تھا" بوڑھے نے کہا۔

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "موہنجو ڈارو میں؟"

"ہاں "— بوڑھے کے چہرے پر جھرّیاں اور بھی گہری ہو گئیں۔ آنکھوں میں بجھتی چمک بھڑکی۔

"لیکن وہ تو بہت قدیم زمانے کا شہر ہے۔"

"کیا میں قدیم نہیں ہوں؟"

!

"یہ وہی شہر ہے، جہاں سے وہ رقاصہ"

"ہاں۔"

"لیکن وہ تو معدوم ہو چکا ہے۔ ایک زمانے کی بات ہے۔"

"ہر شے معدوم ہو چکی ہے، ایک زمانے کی بات ہے۔ بوڑھے نے آنکھیں جھپکیں۔

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ہم نے سلاخیں تھام لیں۔

بوڑھا ہنسا— "وہ مشہور رقاصہ میری بیوی تھی۔ اس نے آہ بھری

"میرا شہر"

ہم سب کو سانپ سونگھ گیا۔

پھر میرے قریب بیٹھا وہ لڑکا، جس کی مونچھیں ننھی ننھی پھوٹی تھیں، یکلخت چیخا

"جھوٹے تم سب جھوٹے ہو، ہم سب کھوئے ہوئے ہیں، ہم سب نہیں ہیں جھوٹے، مکار، بڈھے" — اس نے بوڑھے کو داڑھی سے پکڑ لیا۔

ہیرے دار بکے — لڑکے کی آنکھوں میں خون ابلا، جھاگ بنا، ہم نے ایک

دوسرے سے پوچھا بھلا یہ کیا بیگانہ حرکت تھی۔ جب پہرے وار لڑکے کو لے
گئے تو ہم میں سے ایک نے سرگوشی کی ۔

یہ اس مشہور ندرتہ قاعدہ کا حرامی بچہ ہے ۔

ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ۔

ہم سارا سارا دن مٹی کی ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر ٹرکوں میں ڈالتے رہتے
ہیں ————

چپ چاپ ۔

ہم قیدی نہیں ہیں ۔ صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا ہے کہ ہم قید
میں ہیں ۔ ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہریں ہیں ۔

ہم چھوٹے سے ٹیلے پر سنناٹے کے سائے بیٹھے ہیں ۔

اٹھو اٹھو کام کرو ۔ بھاگنے کی سوچ رہے ہو؟ —— سازشی
ان میں سے ایک کو کے غزایا ہے ۔

ہماری چپ سازش ہے اور ہم سوچتے رہتے ہیں کہ یہ کب
مکمل ہوگی ۔

دیوار اور دروازہ

دس بجنے میں پانچ منٹ !

اس نے دروازے کی اوٹ میں ہو کر سوچا —— ایک دفعہ اس دروازے سے باہر قدم رکھ لوں تو پھر آزاد ہو جاؤں گا —— لیکن ہسپتال کے پورچ میں بڑی تیز روشنی تھی اور چوکیدار ہاتھ میں چھڑی لئے ٹہل رہا تھا۔ پورچ سے ذرا آگے دھندلی سی دیوار تھی۔ میں اس دیوار کو کیسے پھاندوں گا۔ اس نے دروازے کی اوٹ سے ذرا سا سر نکال کے دیکھا۔ اسے بین تو دور تک دروازہ نظر نہیں آتا۔ اس کمبخت وارڈ کے بیرے نے مجھے یہ بتایا ہی نہیں تھا کہ پورچ کے سامنے دیوار ہے۔ ایک روپیہ خواہ مخواہ حرام ہو گیا۔ اگر دیوار نہ بھی ہوتی تو میں اس روشنی کے جال سے بچ کر کیسے نکلتا۔ اس کی نگاہیں پھر دیوار کو ٹٹولنے لگیں۔ میری نظریں اس دیوار پر پھنس گئیں

رہی ہیں۔ یہ ـــــ یہ تو وہی دیوار ہے ـــــ وہی میرا سایہ ہے ؛
پورچ میں گڑگڑ گڑ کی آواز آ کر وہ روشن آنکھوں میں بجھی۔ چوکیدار
ایمبولینس کے ڈرائیور کیطرف بڑھا۔ دیوار کا بند وبست بعد میں ہو جائے گا۔
پہلے میں یہاں سے تو نکلوں۔ وہ کچھ اور سوچے بغیر وہاں سے نکل آیا اور
ایمبولینس کی آڑ لے کر دبے پاؤں پورچ سے نکل گیا۔

یہ دیوار کہاں گئی ؟ اوہ ـ اوہ سامنے ہے ، اپنی جگہ سے کھسک گئی۔ یا پہلے
ہی نہیں تھی۔ نہ وہ روشنی اور اندھیرے کے گھلتے ہوئے سرمئی تالاب میں کھڑا
تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا چوکیدار اور کالیطی کے بیرے زخمی کو ایمبولینس سے
نکال رہے تھے ، اسے جھرجھری آگئی۔ اس نے منہ پھر سامنے دیوار کی طرف کر
لیا۔ نہیں وارڈ بیرے پر میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ وہ مسکرایا۔ یہ دیوار
تو میری آنکھوں میں ہے۔ اچھا اس نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں دائیں طرف کو گیا تو
ممکن ہے پکڑا جاؤں اور اگر اس سامنے کی عمارت کے ساتھ ساتھ چل کر بائیں
جانب مڑا تو میں گیٹ سے باہر نکل جاؤں گا۔

رات تاریک تھی۔ پورچ کی روشنی دالان میں کھڑی کار دن تک پہنچ کر دم
توڑ دیتی تھی۔

کوئی بھی دیکھ تو نہیں رہا۔

نہیں۔

ڈیوٹی کے سپاہی کالیطی میں زخمی کی رپورٹ لکھنے چلے گئے تھے۔ چوکیدار
اپنی چھڑی سے ایمبولینس کا ٹائر بجانے میں مصروف تھا۔ ورد فٹ پاتھ پہ ہو گا

نرسوں کے سایے اپنے دوستوں سے جدا ہو کر جلدی جلدی ہوسٹل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کافی دور گیٹ کا چوکیدار ایک کار روکے کھڑا تھا جو کہ باہر جانے کے راستے سے اندر آ رہی تھی۔ بھلا یوں بھی کبھی ہوا ہے۔ وہ مسکرایا۔

اور تو کوئی نہیں، صرف کتوں کا راج ہے —— اے اے —— بھونکتا نہیں۔

کتے آپس میں بہت مصروف تھے۔

کہیں وہ چوکیدار اس کار والے کو اندر آنے کی اجازت نہ دے دے اور میں اس کار کی روشنی میں برہنہ ہو جاؤں گا۔ کار آہستہ آہستہ گیٹ سے اندر بڑھنے لگی۔ سرمئی تالاب میں کھڑے کھڑے اس کا سانس پھول گیا۔ وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔ وہ — وہ دیوار —— ؟ ہاں وہ رہی سامنے، لعنت ہے مجھے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اور وہ اندھیرے میں بے تحاشا بھاگنے لگا اور سامنے دیوار تک پہنچتے اسے صدیاں بیت گئیں اس نے ہانپتے ہوئے عمارت کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ تو یہ وہ دیوار نہیں ہے۔ یہ تو اینٹوں کی دیوار ہے۔ اس نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے دیوار کا جائزہ لیا۔ اس میں تو دروازے کھڑکیاں بھی ہیں، تو وہ دیوار نہیں ہو گی۔ میری آنکھوں کے سامنے جل گئی ہو گی۔

وہ دیوار سے پیٹھ لگائے گھسٹتا ہوا چلنے لگا۔ پشت سے وہ بالکل محفوظ تھا۔ اگر کوئی اس کا پیچھا کرتا آئے گا۔ تو اس کے سامنے ہو گا۔

چھ۔۔۔۔۔۔

اس کا ہاتھ فوراً ہینڈل پر جا پڑا۔ اور وہ پیچھے گرتے گرتے بچا۔ دروازہ اس نے مڑکر دیکھا۔ یہ کونسی جگہ ہے۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں سیاہ ہو گئی تھیں یا روشنی میں اندھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اس کی آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے میں سرمئی تالاب کی تہہ میں پہنچ گیا ہوں یا —— اس نے دروازہ کے ہینڈل سے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھیں ملیں۔ کئی روشن داغ مختلف سمتوں سے آ کر مرکز میں ملے اور پگھل کر ستارہ کا داغ نقطہ بنتا بنتا سیاہ قبا پر پھیل گیا۔

کسی اختلاف پر باہر کتے بھونکے۔ وہ پلٹ کر دروازے کے پیچھے ہو گیا۔ دالان میں چند سائے تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ بھونکنے، رہو سالو اس نے دروازہ بند کر دیا اور کتوں کی آواز ڈوب گئی

کون ؟ ن ن ن ن

تو گویا میں کسی بہت بڑے ہال میں آ گیا ہوں ۔

کسی کے ہاتھ نے جلتی ہوئی موم بتی بلند کی۔ " بولو ! کون ہو تم ؟ مم مم " میں ؟ — وہ شعلے کی طرف بڑھا۔

میں ؟ میں ؟

موم بتی والے نے قریب ہی دیوار کی طرف دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ ہال روشن ہو گیا۔ کتنا سیاہ رنگ ہے اس کا۔ جبھی تو اندھیرے میں نظر نہیں آیا۔ موم بتی کا شعلہ بھی سیاہ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھ بھی تو ایک ہے۔ سانچلو پورے دس۔

اس کی نظریں سامنے دیوار پہ لگے کلاک سے اتر کے ہال میں گھومنے لگیں۔ ہال
کے اس شروع سے لے کر اس شروع تک لوگ سفید چادریں تانے سو رہے
تھے۔ یہ بھی ہسپتال ہے۔ وہ گھبراہٹ میں مڑا۔ لیکن یہ مریض تو پلنگوں کی بجائے
میزوں پہ پڑے ہیں۔ پہلی مرتبہ میں مدتوں سے بسنے والی بو نے اس کے دماغ
کو چیرا۔ یہ بو وارڈ کی بو سے مختلف ہے۔ سوں، سوں۔
پہلی میز کے قریب کھڑے تنہا آنکھ والے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا
"تم تو ہسپتال سے بھاگے ہوئے ہو۔
ہال کی اونچی چھت کو فرش سے ملاتے ہوئے ستون، محرابیں، غٹر غوں
غٹر غوں، روشندانوں میں کبوتر پھڑ پھڑائے۔ یہ بو کیسی ہے؟ وہ
ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ یہ خوشبو ہے یا بدبو سوں سوں۔
ایک آنکھ والے نے اپنے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پہ پھیلی مسکراہٹ کو
برقرار رکھتے ہوئے کہا "یہ فارمین کی بو ہے اور تم گونگے ہو؟"
اس نے غور سے اس کو دیکھا۔ تنہا آنکھ والے کی آنکھ ماتھے میں نہیں تھی
"نہیں سائیکلوپس۔"
"تو پھر تم بولتے کیوں نہیں؟"
بلکہ اس کی دوسری آنکھ کی جگہ بالکل سپاٹ تھی۔
"میں اسٹول پہ بیٹھ جاؤں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "میں بہت
تھکا ہوا ہوں۔"
"بیٹھ جاؤ" — وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ "ہوں! اب تم وارڈ

سے کیوں بھاگے ؟ "

" وارڈ ؟ ۔۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا ۔ میں تو کبھی ہسپتال میں داخل ہی نہیں ہوا۔ "

" جھوٹے ۔ تم نے ہسپتال کی وردی پہنی ہوئی ہے ۔ "

" میں نے ؟ ۔۔ اس نے اپنے لباس کو دیکھا۔ نہیں ! ۔۔ نہیں ۔ نہیں تو "

" ہا ہا ہا ۔۔ " وہ ہنستے ہنستے سٹول پر بیٹھ گیا ۔ " تم مجھے جھٹلا نہیں سکتے ۔ لمبی دھاریوں والا کرتہ اور پاجامہ ۔۔ ہسپتال میں آکر ہر ایک کو یہ لباس پہننا پڑتا ہے ۔

دھاریوں والا کرتہ اور پاجامہ ؟ ۔۔ نہیں ۔۔ یہ دھاریاں کہاں ہیں ۔ یہ تو سلاخیں ہیں ۔ اور میں قید میں ہوں ۔ " یہ لباس تو میں شروع سے پہنے ہوئے ہوں ۔ "۔۔

" لباس تو یہی ہوتا ہے "

پھر سلاخیں یہاں آکر ظاہر ہوتی ہوں گی ۔ پہلے اگر میں آزاد ہوا تھا ۔ قید ہوا تھا ؟ یہاں آنے سے پیشتر تو کوئی آزاد ہوتا ہے ۔ نہ قید ۔۔ اور میں ازل سے ہوں ۔۔ " نہیں ۔ میرا مطلب ہے شروع سے ۔۔ ازل سے ۔۔

" میں نہیں سمجھا ۔۔ بہر حال تم یہ بتاؤ کہ وہاں سے بھاگے کیوں ؟ "

" کیوں بھاگا ؟ ۔۔ بڑی سیدھی سی بات ہے ۔ میں وہاں رہنا نہیں چاہتا ہوں گا ۔ "

——— یہاں کیوں آگئے۔

"کیوں آیا ہے محض اتفاق سمجھ لو ——اس نے اپنے کندھے جھٹکائے،

"اور تم کون ہو؟

"میں کون ہوں!" میں کون ہوں؟"

ہال میں ہنسی کی بازگشت۔ ۔ مجھے کیا پتہ! پھڑ پھڑ پھڑک، غٹر غوں، غٹرغوں
یہ مجھے جانتا ہے؟ اس کے کہنے کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے جیسے
اسے سب پتہ ہو۔ یہ مجھے بتا سکتا ہے۔ کاش میں بتا سکتا میں کون ہوں ——— میں بکھرے
لمحوں کو کیسے جمع کروں، وہ تو راکھ ہو کر ہواؤں میں بکھر گئے۔ یہ مجھ سے
کہے جا رہا ہے کہ میں ہسپتال سے آیا ہوں۔ لیکن مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ
نہ میں کہیں سے آیا ہوں اور نہ کہیں گیا ہوں۔ میں تو یہیں تھا اور یہیں ہوں۔ اگر
میں کوئی تھا تو اسے ضرور پتہ ہوگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تنہا
آنکھ والے کے کندھوں کو تھام کر اس کی آنکھ میں التجا کرنا چاہی۔ لیکن جیسے
اس کے کندھے تھے ہی نہیں۔ اس کے ہاتھ اس کی گودی میں ہی لوٹ آئے۔
تنہا آنکھ اس کی آنکھوں کو نگلنے لگی۔ اس کو کپکپی آگئی۔ اس نے اپنی نگاہیں جما کر یہ
دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ میز کے ساتھ لگ کر اپنے ہاتھ سے کیا کر رہا ہے۔
لیکن اس کی آنکھ میں مقناطیس تھا۔ ایک آنکھ والے نے پلاسٹک کی چادر سے جھانکتا
ہوا خشک ہاتھ دکھایا۔ " ——— ہوں۔ تو۔ "

ہوں تو کیا؟ ——— یہ مجھی سے سوالات کیے جا رہا ہے۔ میں بھی تو اس
سے پوچھوں ——— یہ کون ہے، یہ جگہ کون سی ہے۔ اور یہ پلاسٹک کی چادر

کے نیچے کون لوگ پڑے ہیں۔ اس کا دل ہال میں گونجنے لگا۔ میں اس سے پوچھوں؟
اس گونج کے لاتعداد آبشار اس کے دماغ میں گرنے لگے۔ اس نے اپنے
ہاتھ کانوں پر رکھ دیئے۔ ـــــ یہ شور، یہ شور ـــــ یہاں تو اتنی خاموشی تھی؟
اس کی آنکھیں ابھر آئیں۔ پتلیاں پھیل گئیں۔ ساری روشنی پسینے میں ڈوبے
شیشوں پر بکھر گئی۔ ـــــ یہ شور ـــــ یہ شور ـــــ میں اندھا ہو گیا ہوں۔
وہ چیخا۔

"تم کہاں ہو ؟"

"تمہارے پاس ـــــ کیوں کیا بات ہے ؟"

مجھے معاف کر دو ـــــ معاف کر دو ـــــ آئندہ کبھی ایسا خیال اپنے
ذہن میں نہیں آنے دوں گا۔"

کیسا خیال ؟ ـــــ اس نے آنکھ جھکا کر ابھری ہوئی پلاسٹک کی چادر پر
انگلیاں پھیریں۔

"تمہیں نہیں پتا ؟ ـــــ وہ حیران رہ گیا۔ آبشار خشک اور آنکھوں کے شیشے
بالکل صاف ـــــ

"نہیں۔"

"نہیں تمہیں پتہ ہے۔ تم خواہ مخواہ بن رہے ہو۔ ابھی میرے ذہن میں
ایک خیال آیا تھا۔"

"عجیب پاگل آدمی ہو۔ میں تو الف بے تک نہیں پڑھ سکتا۔ خیال کیسے
پڑھ سکتا ہوں۔"

"میں یونہی ڈر گیا تھا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ "نہیں یہ جھوٹ کہتا ہے۔ اگر یہ واقعی لاعلم ہے تو اس کی باتوں میں تمسخر کیوں ہے۔ شاید میرا وہم ہو۔

"تم جاؤ۔ میرے کام میں حرج ہو رہا ہے۔" اس نے پلاسٹک کی چادر پر اپنی آنکھ گاڑتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟" —— بڑے آرام سے یہ سوال اس کی زبان سے پھسل گیا اور وہ اپنی جرأت پر حیران رہ گیا۔

"میں؟" اس کی آنکھ بڑی تیزی سے پلاسٹک کی چادر سے نکل کر اس کی آنکھوں میں پیوست ہو گئی۔ اس کے پیٹ میں خلا پھیلنے لگا۔ "میں نے یہ کیوں پوچھا۔ خلا ریت میں رینگتا ہوا اس کے حلق میں آ کر اٹک گیا۔ مجھے تتلی کیوں ہونے لگی ہے۔ یہ عجیب سایہ ہے کہ روشنی میں بھی سینے کو چاٹتا ہے اور اندھیرے میں بھی حلق کو ڈستا ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ سے حلق کو تھاما اور خشک تلخی کو نگلا۔ آنکھ اس کی آنکھوں میں پگھل گئی۔ مسکرا دی۔ "میں یہاں صفائی وغیرہ کرتا ہوں۔"

"صفائی وغیرہ؟"

"بھنگی کہہ لو، خاکروب کہہ لو۔ چوہڑا کہہ لو۔ بعض لوگ مجھے سویپر بھی کہتے ہیں۔"

"تو یہ سویپر ہے میاں کا۔ میں خواہ مخواہ خائف ہو رہا تھا۔ ہنہ۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں تمہیں سائیکلوپس سمجھا تھا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"وہ ایک جن تھا۔ جس کے ماتھے میں ایک آنکھ تھی اور"

"میں وہ نہیں ہوں۔" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نہیں جاتی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے ؟"

"جو نام مرضی آئے دے دو۔ خاکروب کہہ لو، مگر سائیکل نہیں۔"

"ناموں سے مجھے بھی دلچسپی نہیں۔ اسی لئے مجھے خود بھی اپنے نام کا پتہ نہیں۔ —— یہ جگہ کون سی ہے ؟"

یہاں مُردوں کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ اس سامنے والے دروازے کے ساتھ کا دروازہ مُردہ خانے میں کھلتا ہے۔ یہاں پر وہ لاشیں رکھی جاتی ہیں، جن کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ یہ مُردے ڈائیسکشن ہال میں نہیں آتے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

"یہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔"

"ہاں! مگر یہاں آنے سے لوگ ڈرتے ہیں۔"

"بے وقوف ہیں —— تم —— تم ہر وقت مسکراتے رہتے ہو۔ ؟"

"سب کو مجھ سے یہی شکایت ہے۔"

پورے دس بجے تھے۔

"اس وقت تم بیٹھے یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

اس کی آنکھ میں ایک مرتبہ پھر بجلی کوندی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے تھوک نگلی —— نہیں نہیں —— میں اپنا سوال واپس لیتا

ہوں۔ حاکروب کا ہاتھ بڑی تیزی میں میرے سے اٹھا اور زرا سننے ہی میں پھر میٹھی بن کر میز پر جا پڑا۔ اس کی غائب ہوتی مسکراہٹ پھر لوٹ آئی۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں الٹے سیدھے سوال کرنے کی عادت ہے۔ میں دن رات یہیں رہتا ہوں جب لڑکے ڈیسیکشن کر کے جاتے ہیں تو میں زخموں کو فارملین سے صاف کرتا ہوں تاکہ کیڑے نہ پڑ جائیں۔ پوسٹ مارٹم میں نکلے اعضاء کو فارملین کے مرتبانوں میں محفوظ کرتا ہوں اور ہر قسم کی گندگی اور بو سے پاک رکھتا ہوں۔

سوں، سوں ——— اس نے اپنی ناک کو انگلی سے ملا ———

" ہاں! ——سنا ہے یہاں سے بو آتی ہے۔ لیکن بو کوئی چیز نہیں۔ مجھے تو بو نہیں آتی۔ اچھا اب تم جاؤ۔ "

میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔

اس نے ایک بار پھر یہاں کا جائزہ۔ ایک کونے میں سجی الماریوں میں بہت سے مرتبان پڑے تھے۔ " یہ کیا ہے ؟ " ——— وہ اس کا جواب سنے بغیر اٹھ کر الماری کے سامنے جا پہنچا۔ دل گردے، جگر، دماغ، جسم کے کٹے ہوئے حصے اور بچے۔ نوزائیدہ بچے ——— مرتبانوں میں بیٹھے پیارے پیارے ننھے ننھے منے بچے۔ چند ایک نامکمل اور بہت سارے مکمل۔ پیاری پیاری ادھ کھلی آنکھیں۔ بازو اور ٹانگیں پیٹ سے جوڑے۔ ٹھوڑی کو سینے سے لگائے حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ بڑھایا اور شیلف پر ایک مرتبان کو اپنی طرف سرکایا۔

" او ہوں۔ "

اس نے گھوم کر دیکھا۔ خاکروب اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ "نہیں اسے مت نکالو۔ اگر مرتبان گر کے ٹوٹ گیا تو یہ جگہ خالی ہو جائے گی۔" اس نے اپنی آنکھ کے مقناطیس کو اس کے اور قریب کرتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"آؤ — ادھر آجاؤ۔"

اس کا سارا خوشگوار سا ہیجان اس آنکھ میں کھو گیا اور وہ منہ لٹکا کے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ پہلی میز کے قریب پہنچ کر اس نے کہا۔ "مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کون ہو — کیوں آئے ہو اور ایسی ہی بکواس۔ اب تم مہربانی کر کے چلے جاؤ۔"

"کہاں جاؤں؟"

جہنم میں جاؤ۔ جہاں مرضی ہے جاؤ۔ لیکن یہاں سے چلے جاؤ۔ اس نے بہت بے صبری سے پہلی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا" اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔ "مجھے یہاں بڑا سکون ملا ہے۔"

"او — تم کیا چیز ہو۔" وہ بالکل اکتا گیا تھا —

"میں؟"

"میں؟ — اس نے پتھریلی میزوں پہ پلاسٹک کی چادروں میں لپٹے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ یہ میرا ہاتھ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ٹٹولا — یہ میرا جسم ہے۔ یہ میں ہوں! اور سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔

اس لیے کہ میں ہوں۔ کسی طرح میں بھی یہ ملائم چادر اوڑھ کر پتھر کی نرم نرم سطح پر نہیں سو سکتا؟ میں بہت تھک گیا ہوں۔

" میں یہ چادر اوڑھ کر یہاں سونا چاہتا ہوں۔

" تمہیں ڈر نہیں لگتا۔؟"

" جب یہاں میری آنکھ کھلی تھی تو ڈر لگا تھا۔ اب نہیں ---- اور تمہیں ---؟"

" نہیں " خاکروب نے پہلی مرتبہ اسے چھوا۔ جانے کیوں اس نے بڑی شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا " تم جلد ہی اکتا جاؤ گے۔ تب تک تم یہاں جو چاہے کرو۔ لیکن میرے کام میں حرج نہ کرنا۔" اس نے پہل میز کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی اس مہربانی کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ چلو شکر ہے اتنا تو مانا۔ اگر میں نے تھوڑی سی اور ضد کی تو یہ مجھے میز پر سلا بھی دے گا --- " اچھا!"

وہ اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا ہاتھ ہٹتے ہی اس کے جسم میں عجیب اجنبی سی رَو دوڑ گئی۔ میرے لہو میں یہ کنکری کہاں سے آ گری۔ میں سر سے پیر تک لرز گیا ہوں۔ اس نے خاکروب کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہاتھ میں کٹا ہوا بازو پکڑے اس پر سے گوشت کھرچ رہا تھا۔ قریب ہی جسم کے دوسرے پرزے بھی پڑے تھے۔

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا کندھا سہلایا۔ جب بہتے خون پر کنکریوں کی بارش ہو جیسے، وار ہے۔ دائرے میں اس کی حرکت کیوں بڑھ رہا

ہوں۔ میں اس کے پاس کیوں بیٹھ گیا ہوں۔ اور دائرے، میرا خون جہاں کنکری گرتی ہے، وہیں ایک خلا ابھرتا ہے، اور اس کے گرد جھینتیں۔ یہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔ یہ جھینتیں میرے ذہن کی دھند کو چاٹ رہی ہیں تم نے میرے پیلے کندھے پر ہاتھ کیوں نہیں رکھا۔ —— سنو —— سنو —— دیکھو دیکھو سائیکلوپس میں کیا ہوں —— میں کون ہوں خاکروب —— اور یہاں کیوں آیا ہوں —— سب کچھ چھوٹ گیا ہے اور ——

میری آنکھوں نے جب دیکھا تھا اور جس طرف بھی دیکھا تھا۔ دھندلے شیشے کی ایک بہت اونچی دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ اس کے پار کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں اپنے لاغر ہاتھوں سے دیوار میں اس دروازے کو ٹٹول رہا جو کہ وہاں نہیں تھا۔ میری آنکھیں دیوار میں اس عکس کی تلاش میں تھیں۔ لیکن شیشہ اندھا تھا۔ میں نے دیواروں کو اپنی آنکھوں کا نور پلایا۔ لیکن دیواروں کی خشک کانٹے دار زبانیں میرے جسم پر رینگنے لگیں اور میں بھاگنے لگا۔ ایک دیوار کا خاتمہ اور دوسری کا آغاز —— بھول بھلیاں —— زبانیں میری چاروں طرف —— دروازہ کہاں ہے۔ میں اس بھول بھلیاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہ لاتعداد سمتیں مجھے نوالہ بنائیں گے۔ —— رسی کا سرا کہاں ہے! —— رسی کہاں ہے؟ —— یہ زبانیں —— یہ سینٹورز بولتے کیوں نہیں؟ —— آواز کہاں گئی؟ —— اتنی چپ —— اتنی خاموشی زبانیں گنگ۔ خاموشی بھی گنگ۔

یہ یہاں اتنی خاموشی ہے۔ میں اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ کے پوری قوت

سے چیخا۔ لیکن میری آواز کس نے نگل لی۔ میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میرے
پٹھے اکڑ گئے اور میرے پیٹ میں غبار۔ وہی متلی اور رقت — یہ مجھے قے
کیوں نہیں ہوتی؟ میں نے اپنے حلق میں انگلی ڈال کر قے کرنا چاہی۔ لیکن
انگلی میرے منہ تک پہنچتے پہنچتے رک گئی۔ میرے بند کانوں میں دور کہیں سے
گھنٹی کا رس ٹپکا۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن آواز آواز —— میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں ہوں
موجود ہوں۔ میں نے آواز سنی ہے۔ آواز قریب آتی گئی۔ اور میں نے
اپنی بے نور آنکھوں سے ایک مضبوط مردانہ ہاتھ کو اس چھوٹی سی گھنٹی کو
ہلاتے دیکھا۔ میں نے تعظیم میں اپنے گھٹنے اور ہاتھ ٹیک دیئے اور اپنے
محسن کے پیر چاٹنے لگا۔ یہ میری رسّی ہے۔ یہ مجھے اس لیبرنتھ سے نکال
لے گا۔ پیر چاٹتے چاٹتے میری زبان اتنی لمبی ہو گئی۔ کہ میری سمجھ میں نہ آیا
کہ اسے منہ میں کیسے ڈالوں گا۔ پیر میرے آگے آگے چلنے لگے۔ میں نے
اس رسی کا سرا تھام لیا۔ دیواریں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں اور دروازہ تھا
کہیں نہیں تھا۔

میرے محسن نے گھنٹی میز پر رکھ دی اور مجھے گود میں بٹھا کر پچکارتے ہوئے
میرے دانتوں میں گوشت کا ٹکڑا پکڑا دیا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام پاولوف
ہے۔ اور میرا نام پاولوف کا کتا۔ وہ گھنٹی بجاتا تو جانے میرے منہ سے رال
کیوں ٹپکنے لگتی۔ وہ میرے منہ سے رال ٹپکتے دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور پھر
مجھے کھانے کو بہت ساری چیزیں دیتا۔ جب بھی گھنٹی بجتی مجھے بھوک لگ
جاتی۔ وہ میرے منہ کے ذریعے سے نالی ڈال کر میرے پیٹ سے کچھ نکالتا۔

پھر میری بھوک مٹ جاتی، میرے سامنے دھندلے شیشوں کی دیواریں ناچنے لگتیں، متلی ہوتی اور میں پیٹ تھام کر دیواروں سے سر ٹکراتا۔ گھنٹی کی آواز، شیشے کی دیوار تھی، پاویوف ہر وقت بیٹھا ایک موٹے سے رجسٹر پر تاش کے پتوں کے گھر بناتا رہتا۔ ایک مقام پر جب وہ ایک پتہ اور رکھتا تو ساری عمارت گر جاتی اور وہ پھر گھر بنانے لگتا۔ میں اسے اس مشغلے میں منہمک دیکھ کر شیشے کی بستی کی گلیوں میں پھرنے لگتا اور سوچنے لگتا کہ میں کتا نہیں ہوں کیونکہ ـ

میرے ماں باپ نے مجھے انسان جنا تھا اور میں انسان ہوں، لیکن مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرے والدین بڑے پریشان رہتے تھے کہ میں کتابیں چاٹتا جا رہا تھا فقرے کا اختتامیہ نقطہ بن جاؤں گا۔ میں اپنے والدین کے اس خوف سے بڑا محظوظ ہوتا تھا، اور ان کی عقل پہ حیران بھی جو کہ بالکل اوسط درجے کی تھی جملے کا اختتامیہ نقطہ کتنی بڑی بات انھوں نے کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ میں عنقریب جملہ کا خاتمہ بننے والا ہوں۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم کاغذ کی سطح کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے ٹک ـــ اور ختم ـــ قلم کی نوک کاغذ میں چبھنے ہی والی تھی کہ میرے والدین کو بڑی اچھی ترکیب سوجھی۔ انھوں نے میری تمام کتابیں جلا دیں اور مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے سب لوگوں کی طرح زندہ رہنے کی کوشش نہ کی تو مجھے گھر سے نکال دیا جائے گا۔ تب میں زندہ رہوں گا۔ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا مجھے صدمہ یہ تھا کہ میں

اپنی کتابوں کے ساتھ ستی نہ ہو سکا۔ نقطہ نہ بن سکا۔ میں ہر وقت کتابوں کی راکھ کے پاس بیٹھا چٹکی چٹکی راکھ اپنے سر میں ملتا رہا۔ زخموں پر لگاتا رہا۔ سب طعنے دیتے تھے کہ کچھ کرتا نہ کراتا ہے۔ چوبیس گھنٹے راکھ پھانکتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اس سے بہتر اور کام کیا ہو سکتا ہے راکھ پر میرا گزارہ نہیں ہو رہا۔ پھر محلے کی عقلمند بڑی بوڑھیوں نے میری ماں کو مشورہ دیا کہ میرا بہترین علاج شادی ہے مجھے اس علاج میں حرکت نظر آئی۔ نہ زندگی نظر آئی۔ یہ سب کچھ اسی تحریک کا قصور تو تھا تو پھر یہ کیوں ۔۔ آخر یہ سب کیوں۔ اس لئے کہ ۔۔ تو پھر ۔۔ یہ اس لیے کہ

پھر پھر ۔۔۔ پھر ۔۔۔ ؟

تو ۔۔۔ ؟

فل سٹاپ ۔۔۔ ؟

جملے کا آغاز ہی نہیں ہونا چاہیئے تاکہ نقطہ بنانے کی کشمکش نہ کرنی پڑے لیکن اس جملے کا نقطہ کہاں ہے۔ ماں! میں یہ فل سٹاپ ڈھونڈھ لاؤں! پھر تم جو جی میں آئے کر لینا۔ میں اس نقطے کی تلاش میں گھر سے بھاگ کھڑا ہوا اور شیشے کی دیواروں کے پیرہن میں گھر گیا۔

پیاز کے چھلکے اور چھلکے تھے اور اس کے اندر اور چھلکے ۔۔۔ جب میرے ہاتھ میں پیاز چھوٹا ہوتا چلا گیا تو میں بہت گھبرایا۔ پیاز بھی مجھے نقطہ ڈھونڈھ کے نہ دے سکا۔ اگر میرے والدین کو پتہ چلتا تو بہت خوش ہوتے کہ چلو بیٹا پیاز کھا رہا ہے۔ ایک روز جب پیاز کے مرکز کے گرد

چھلکوں کے چند ایک دائرے ہی رہ گئے تو میں تذبذب میں پھنس گیا، کہ آگے بڑھوں یا نہ۔ مجھے ہر وقت متلی ہونے لگی تھی۔ پاولوف مجھ سے بہت ناراض تھا کیونکہ وہ پتوں کے بنتے گرتے گھر سے بہت تنگ آ گیا تھا، اس کی عمارت نہیں بنتی تھی۔ میں نے اس سے کہا، ڈاکٹر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے ہر وقت متلی رہتی ہے۔ اس نے مسکرا کے اپنی لمبی الجھی ہوئی داڑھی میں کھجلی کی، مسکرایا اور مجھے بے ہوش کر دیا۔ جب میں اٹھا تو میرا پیٹ میرے سامنے پڑا تھا۔ پاولوف گھنٹی بجا رہا تھا اور میری کھانے کی نالی سے سیال مادہ ٹپک رہا تھا۔ وہ پھر رجسٹر پر تاش کے گھر بنانے لگا۔ وہ جب اپنی عمارت پر آخری پتا رکھنے لگا تو میں نے اپنے ہاتھ میں پیاز کو دیکھا۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ نقطہ بھی نہیں۔ زمین پر پیاز کے چھلکے گرے پڑے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں اسی وقت پاولوف کے گھر سے بھاگ آیا۔ نقطے کی تلاش میں بھاگنے لگا۔ بھاگتا رہا۔ اپنے پیٹ کے خلا کو تھامے ہوئے۔ متلی کو سینہ میں چھپاتے۔ — پسینہ پسینہ، آنکھوں میں پانی — جہاں جہاں قطرے گرے وہیں پھر دیواریں اگنے لگیں۔ جہاں جہاں میری ایڑی پڑی وہیں وہیں میدان آ گئی۔ رات رات تھی نہ دن دن، روشنی اور تاریکی کا تضاد پاولوف کے گھر بھرے پیٹ میں رہ گیا تھا۔ میں ایک عجیب الجھے سے رنگ میں گھل رہا تھا۔ دھندلے شیشوں کی اگتی دیواریں آسمان سے جا ملی تھیں۔ پھر جب میں چاروں اور، اور میں پھر دروازے کی تلاش

میں لڑکھڑانے لگا۔ دروازہ کہ جو وہاں تھا اور نہیں تھا، پھر جانے کیا ہوا میری آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر پاپوسی میں اپنا سر زور سے ٹکرایا ہوگا۔ مجھے اتنا یاد ہے ایک نہیں کئی نقطے میری طرف بڑھ رہے تھے اور میں بہت خوش تھا، بہت خوش کہ پیار کے مرکز میں پاپوسی نہیں بلکہ نقطوں کی ماں ہے۔ اس شئے کہ وہ نہیں ہے اور جو نہیں ہے وہ ہے۔ رنگ محل جس کا کوئی رنگ نہیں۔ گہرائی جس کی کوئی گہرائی نہیں، دکھ جس کی [illegible] دکھ نہیں۔ میں جس کا کوئی [illegible] نہیں۔ میں نہیں کہ پا رہا تھا نہیں جو کہ نقطہ تھا، نہیں تھا۔

کہاں، کہاں۔

نقطے میں سے یہ چھوٹی سی لکیر کیوں نکل آئی ہے۔ ؟

کویا!

وہ ملگجا رنگ چھٹ گیا۔ چھٹ گیا۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ نرسیں ڈاکٹر، شیشے، دیواریں۔ تم نے مجھے روشنی کیوں دی۔ تاریکی کیوں دی ؟

دیوانہ

میں بہت خوش تھا۔ بہت خوش۔ لیکن تم نے مجھے دکھ سے چھین لیا

پاگل۔

میرے جسم پر سلاخیں تھیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اپنا لباس نظر آیا۔ میں شروع ہی سے اس قید میں تھا کہ ان لوگوں نے مجھے ڈالا ہے ؟

وقت جو گزرا نہیں تھا۔ گزرنے کا لمحہ جو کہ بے جان تھا۔ میری گردن کو

اپنے دانتوں میں جانے لگا۔ اور میں بڑے کرب میں ۔ امید ہے بچ
جائے گا۔

کیوں، کیوں؟ نہیں نہیں تم نے مجھ سے نقطہ چھین کر یہ لفظ
مجھے دے دیا ہے۔ میں پھر اسی تلاش میں وہاں سے نکل آیا ہوں۔ تم
سچ کہتے ہو، میں ہسپتال سے بھاگ آیا ہوں۔ میں بہت اکتا گیا ہوں اٹھ لو۔
کرو کہ مجھے میز پر ڈال کر پلاسٹک کی چادر اوڑھا دو، تاکہ میرا عذاب ختم
ہو۔۔۔؟

"ہوں؟ اس نے فرش پر پڑی ہڈیوں اور گوشت کے ریشوں سے اپنی نگاہیں
چھڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ اسی پہلی میز
کے کنارے بیٹھا۔ پلاسٹک کی چادر سے نکلا ہاتھ پکڑے جانے کیا کر رہا تھا۔ یہ بار بار
میز کے پاس کیوں چلا جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر خاکروب کے پاس آیا۔ اس نے وہ ہاتھ فوراً چادر
کے نیچے چھپا دیا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تم اٹھ کر چلے کیوں آئے۔

"مجھے تمہاری باتوں میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ہر لمحہ جو کہ تھا۔ نہیں رہتا تھا
اسی لئے مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ اب اتنی مشکل سے مجھے
کے دانتوں میں جان پڑی ہے تو تم ۔۔۔" وہ اسے الوؤں کی طرح دیکھ
رہا تھا۔ "ہاہا۔ تم نہیں سمجھو گے۔ آخر تم سویپر ہو۔"

خاکروب کے ہونٹ اسی مسکراہٹ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے
میزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تو تم بھی ان کی طرح ۔۔۔"

"ہاں ہاں" اس نے بے صبری سے کہا۔

"وقت تو آ جانے دو۔"

"وقت آ گیا ہے"

"اچھا! ادھر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں" اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ "نہ ۔۔۔ نہ ۔۔۔ اس کو نہ چھوؤ" اس نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

اس نے فوراً اپنا ہاتھ چادر سے ہٹا لیا۔ یہ مجھے اس میز سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ "پہلے مجھے یہ دکھاؤ۔" اس نے اشارہ کیا۔

"نہیں" پہلی مرتبہ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ مکمل طور پر غائب ہو گئی۔

میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں شراب پلا کر بے ہوش کر دوں اور تمہاری آنکھ نکال لوں۔

"ادھر آؤ۔"

وہ چپ چاپ کچھ کہے بغیر اس میز کو کنکھیوں سے دیکھتا اس کے ساتھ مردہ خانے میں آ گیا۔ مردہ خانے کی کھڑکی میں کوئی سایہ لپکا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے خاکروب کو دیکھا "چوکیدار ہے" اس نے ایک جھٹکے میں تختے پر پڑی چادر ہٹا دی۔ "اس نے بھی یہی خواہش کی تھی دیکھو۔" اس نے پھر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چوکیدار کہیں دیکھ نہ لے میں اس کے پاس جاتا ہوں" اس نے مڑتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں

دیکھو اس میرم کے قریب نہ جانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ پھر میں تمہیں
میز پر نہیں سلاؤں گا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور لرزتا لرزتا لاش کے قریب گیا۔ اس نے
ڈرتے ڈرتے لاش کو چھوا۔ جسم برف تھا۔ اکڑا ہوا۔ اس کے دانت باہر کو
نکلے ہوئے تھے، جیسے کوئی کھلکھلا کر ہنس دے اور آنکھیں چھت میں
گڑی تھیں۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سرگوشی کی۔

"ہیلو! تم بھی میری طرح تھے؟ تمہارے جسم پر زخم تو کوئی نہیں۔
تم نے زہر کھایا ہو گا۔ اور اطمینان سے تریس تہ بن گئے ہو گے۔ بس ٹھیک
ہے اخاکروب جلدی لاؤ چادر۔

"خاکروب ___ سویپر ___ سائیکلو ___ د ___ و ___ بس" ابھی نہیں آیا؟
تو بس اب میں وہ چادر اٹھا کے دیکھوں گا اور الماری سے مرتبان اٹھا
کے اس میں سے بچہ نکال کر اسے پیار بھی کروں گا۔ اس پر خوشی کے مارے
ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ جملہ از جلد ہال میں آکر اپنی دریافت
کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جس ہاتھ کو پکڑ کر اس نے ہیلو کہا تھا وہ اسے چھوڑ نا نہیں
تھا۔ اس کا سانس رک گیا۔ اس کی اپنی آنکھیں جامد ہو کر خلا میں اتر گئیں۔
دل بہت زور سے سینے کے ساتھ ٹکرایا اور پھر تیزی سے چلنے لگا۔ اس
کی نگاہیں لرزتی لرزتی لاش پر آ کے رینگنے لگیں۔ اس کے جسم میں یک دم
گرم رو دوڑ کر سرد ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ برف اس کی انگلیوں میں سرایت
کرنے لگی۔ اس جسم کا نیل چمکنے لگا۔ جسم تن گیا۔ پھر ڈھیلا۔ پھر تنا اور تڑپ

تڑپ، منہ میں جھاگ، زندگی بے جان تھی۔ نقطہ زیر بلا، پھانسی، مسلسل پھانسی، مسلسل عذاب۔ ڈھیلے باہر نکل کر لٹکنے لگے تھے۔ تناؤ، جھاگ، اذیت، تڑپ نہیں میرا عذاب تو سر میں تھا اور یہ سارے جسم میں ——— میرا ہاتھ برف ہو گیا ہے۔ چھوڑ دو ——— میرے ہاتھ میں شدید درد ہے۔ کرب میں اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ ——— میرا ہاتھ چھوڑ دو۔

ہنسی ——— قہقہوں کی بازگشت ———

اس نے بوکھلا کر نظریں اٹھائیں۔ لاتعداد سانپ سر اٹھائے جھوم رہے تھے، یہ بازو تو نہیں؟ ہمارے سینے سے لگو۔ دیکھو کتنا گرم ہے کتنا سرد ہے ——— معتدل ہے ——— نہیں ——— میں زمین کے مرکز میں گونجتی سونے کی جھنکار نہیں، بلکہ زمین میرے سینگ پر گھوم رہی ہے میرا سینگ درد میں چور چور ہو رہا ہے، دوسرا سینگ ہے نہیں۔ نہیں ——— میں نے لوگوں سے کبھی نہیں کہا تھا کہ یوں ہونا چاہیئے اور یوں ہوگا اور جب یوں نہ ہوا تو میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ اس لیے نہیں ہوا لہذا میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر کسی سرپھرے نے گولی مار دی۔ زخم سے بہتا ہوا خون سانپ چوستے رہے۔ زخم میں ربڑ کے دانت تھے۔ سانپوں کے سر محفوظ۔ ان کی لمبی لمبی زبانیں اپنے کام میں مصروف۔ خارش ہوتی ہے ...... ختم ہونے والی خارش۔ مرجھایا ہوا بھیانک چہرہ۔ اذیت۔ عذاب ——— نہیں نہیں ——— ہا ہا ہا ——— کتنے لاش کو لئے پھرتے ہیں ———

ہمارے سینے سے لگو، نہیں یہ سانپ تو نہیں ـــــ یہ تو آگ ہے آگ کے شعلے لہرا رہے ہیں۔ شعلوں میں ایک رانی سنگار کئے کسی کے سرہانے بیٹھی ہے ـــــ بچاؤ بچاؤ ـــــ لیکن آواز نہیں آتی جسم پر آبلے ابھر رہے ہیں ـــــ پانی پانی ـــــ جسم آبلہ بن گیا ہے پانی عذاب ـــــ میرے چہرے کو کیا ہو رہا ہے۔ اگر میرا جسم اس سے زیادہ تنا تو ٹوٹ جائے گا۔

آبلہ پھوٹ بہا ہے۔ آبلے میں دائرے۔ لہریں۔ چاند کو چاٹتی سمندر کی لہریں۔ ـــــ آؤ ـــــ ہمارے سینے میں اترو ـــــ میں ڈوبتا کیوں نہیں۔ اف میرا سانس ـــــ میں نیچے ہی نیچے اتر رہا ہوں۔ میرا جسم گل رہا ہے۔ مچھلیاں گوشت نوچنا چاہتی ہیں۔ لیکن گوشت اترتا نہیں۔ شارک کے دانت بلے کار ہیں ـــــ درد ـــــ بے پناہ اذیت ـــــ عذاب ـــــ مسلسل عذاب بستہ، بستہ، بستہ کرب میں ہوں تتلی میرے بالوں کی تالی پر آکے جم گئی ہے ـــــ میں اپنا علاج کرانا چاہتا ہوں۔

ہم لاوارث ہیں۔

نہیں میرا ہاتھ چھوڑ دو ـــــ میں ہسپتال واپس جانا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر ابھی وہیں ہوگا۔ اس نے کھڑکی سے ہسپتال کی گھڑی دیکھی۔ دس بجے ہیں ابھی صرف دس ہی بجے ہیں؟ یہ گھڑی خراب ہے۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ رفتہ رفتہ اس کا ہاتھ نیلا ہونے لگا تھا۔ برف آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ نہیں میں اس نیلی برف کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ اس سے

پاس پڑے پوسٹ مارٹم کے اوزاروں سے آری اٹھائی اور پاگلوں کی طرح اس کا ہاتھ کاٹنے لگا۔ ٹھنڈی نیلی برف کی کرچیاں تیز رفتاری سے اس کے بازو میں چبھنے لگیں۔ ہاتھ کٹ گیا تھا۔ لیکن کرچیوں کی چبھن اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ وہ اپنا بازو دوسرے ہاتھ کی گرفت میں لئے لڑکھڑاتا ہوا آیا پہلی میز کے کنارے آ گے وہ گرنے لگا۔ اس نے اپنا بازو چھوڑ کر میز کا کنارا تھام لیا —— اور —— پہلی میز —— اس نے اذیت بھول کر ایک ہی جھٹکے میں پلاسٹک کی چادر میز سے اتار پھینکی۔ خون کی نوچتی کرچیاں بازو تک آ کے یک دم رک گئیں ——

روشندانوں میں پر پھڑپھڑائے —— غٹرغوں، غٹرغوں ——

اس کے بالوں میں چاندنی تھی۔ راکھ تھی۔ ہونٹ سرخ تھے، بے دانت جبڑوں میں جھنسی زبان سرخ تھی اور آنکھیں —— یہ تو مجھے دیکھ رہی ہیں۔ میری آنکھوں کو چیر کر میرے سر میں دیکھ رہی ہیں۔ جھریوں سے اٹا چہرہ۔ اس کے گلے میں کانٹوں کی کنٹھی تھی اور سرخ قطروں کا ہار۔ سارے جسم پر سلوٹیں —— ہڈیوں کا ڈھانچا سا —— مگر چھاتیاں اتنی جوان جیسے دودھ بھری چھاتیوں پر سلوٹیں کیوں نہیں ہیں ؟

اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ بازو کا درد رفتہ رفتہ اتر رہا تھا اور ہاتھ کے شکنجے کی گرفت بھی ڈھیلی ہو رہی تھی۔

نجانے کب سے اس کے پاس بیٹھا کیا کر رہا تھا۔۔ ؟ —— وہ بار بار اس کے ہاتھ کو چھپا رہا تھا۔

ہاتھ۔

اس نے فوراً اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کی ایک انگلی سے کرمیں بھوٹ رہی تھیں سونے کی انگوٹھی انگلی کے گرد خشک زخموں کے نشان تھے۔ نوزدہ یہ انگوٹھی اتارنے کی کوشش کر رہا تھا ––– چور ––– لیکن اسے اپنے اوپر کتنا اعتماد تھا ––– بالکل گھبرایا نہیں۔ کہیں وہ آنہ جائے۔ میں یہ انگوٹھی اتاروں گا۔ سونا ––– سونا، پالیا ––– اس نے انگوٹھی کو پکڑ کر اتارنا چاہا انگوٹھی کو چھوتے ہی اس کا دوسرا ہاتھ شکنجے سے آزاد ہو گیا۔ اس نے میز پر پڑی چھینی اور ہتھوڑی اٹھائی اور ایک ضرب میں انگلی کاٹ کر انگوٹھی اتار لی۔ انگوٹھی جیب میں ڈالتے ہوئے اس کی نگاہیں الماریوں میں پڑے مرتبانوں کی طرف اٹھیں۔ وہ لپک کر وہاں سے آگے کھسکا۔ مرتبان اٹھا لیا اور ڈھکنا کھول کر اس میں سے بچہ نکال لیا۔ بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جانے اس کے اپنے ہونٹ کیوں مسکراہٹ میں پھیلتے پھیلتے ہنسی میں پھٹ گئے۔ اس نے ہال میں لگے کلاک کی طرف دیکھا۔

دس بجے ہیں ––– ؟ یہ کلاک بھی خراب ہے۔ لیکن ٹک ٹک کی آواز تو آرہی ہے ––– ڈاکٹر کہیں چلا نہ گیا ہو ––– ؟ اس نے پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے وہ نوزائیدہ بچہ، بوڑھی جھریوں سے منڈھی سوکھی رانوں کے درمیان رکھ دیا۔ جیب سے انگوٹھی نکال کر ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لی اور ہنستا ہوا ہال سے باہر نکل آیا۔

وہ پاگلوں کی طرح ہسپتال کی طرف بھاگنے لگا ––– لیکن سامنے وہی

دھندلی شیشے کی دیوار تھی۔ ہسپتال کہاں ہے؟ ——— ارہ ہاں یہ سامنے رہیں ہسپتال کی سیڑھیاں۔ لیکن یہ دیوار پر کیوں چڑھ رہی ہیں —— وہ —— وہ —— دور آخری سیڑھی پر ڈاکٹر۔ —— وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈاکٹر اور دور۔ ڈاکٹر اور دور —— میرے قریب آؤ ڈاکٹر میرے پاس سونے کی انگوٹھی ہے —— اسے میری انگلی میں پہنا دو۔

سیڑھیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ میں تھک گیا ہوں۔ ہانپنے لگا ہوں میں اس سے زیادہ تیز سانس نہیں لے سکتا۔ نہیں میں رکوں گا۔ میں چکرا کیوں رہا ہوں —— متلی چکر۔ سیڑھیاں چڑھتے اس کی آنکھوں میں زمین گھوم گئی۔ نیچے نوکیلے پتھروں کی تیز نوکیں چمک رہی تھیں۔ متلی —— چکر —— چکر —— میں کس چیز کو تھاموں؟ اس کے قدم لڑکھڑا گئے —— متلی —— ارے میں پھسل گیا ہوں، مجھے قے ہو رہی ہے۔ میں گر رہا ہوں۔ گر رہا ہوں۔ میرا چہرہ بھیانک ہو رہا ہے اور اذیت، عذاب، متلی، مسلسل قے۔ خلا میرے گرد بڑھ رہا ہے۔ نوکیلے پتھر میرے جسم میں اتر گئے ہیں۔ میرے گرد خلا سمٹ کر نقطہ بن رہا ہے۔ میرے ہاتھ سے انگوٹھی نکل کر چلنے لگی ہے۔ میں دھندلے شیشوں کی دیوار کے پیروں میں پڑا ہوں۔ میرا خون انگوٹھی کے پیچھے دوڑ رہا ہے شیشے کی دیوار میں دروازہ دیکھ رہا ہوں جو کہ نہیں تھا۔ میرا خون انگوٹھی کا پیچھا کر رہا ہے۔ انگوٹھی کا رخ دروازے کی طرف ہے۔ دروازہ پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔ میرے کانوں میں قہقہے گونج رہے ہیں۔ [illegible] کے فریم میں [illegible] گرداب کا [illegible] کر پھیل گیا ہے —— انگوٹھی [illegible]

کی طرف ہے ۔ اور یہ میرا خون اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے — بھاگ رہا ہے — بھاگ رہا ہے — بھا گ — ر — ہا — ہے ! —

نہ مرنے والا

وہ نیچے پان والے کی دوکان کے ریڈیو پر پورے اعلانات سنے بغیر ہی کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ نالیوں میں بہتا ہوا خون اس کے روئیں روئیں میں پسینہ بن کر تھرک رہا تھا۔ کمرے کا تالا کھولتے کھولتے وہ جھنجلا گیا۔ تالا ہمیشہ چابی کے پہلے پھیر میں کھل جایا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت چابی ہی اندر نہ جا رہی تھی۔ اس نے مضبوطی کے ساتھ ایک ہاتھ سے تالے کو پکڑا اور اپنے آپ پر پوری طرح قابو پاکر تالا کھول لیا۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے چابی نکال کے تالا پٹخا کے فرش پر دے مارا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی گرفت میں پستول کانپ رہا تھا۔ "نہیں نہیں۔" وہ بڑبڑایا اور گرفت چھوڑ دی۔ چابی چھناکے سے فرش پر جا پڑی۔ چابی دیکھ کر اسے جھرجھری سی آگئی اور اس نے میز کے کنارے کو انگلیوں سے

ہتھیلی میں نچوڑتے ہوئے سوچا ــــ آج ایسا موقعہ پھر کبھی نہیں آئے گا اگر یہ آج بھی، پستول ہی کر میرے ہاتھ سے پھسل گئی۔ تو میں آنے والی کل کے زنداں میں ہمیشہ کے لئے قید ہو جاؤں گا۔ اس کے سارے جسم کا پسینہ اس کی ہتھیلی میں جمع ہو کر میز کے کنارے سے ٹپکنے لگا۔ ایک قطرہ، دوسرا تیسرا لمحے ایک ایک کر کے ٹپک رہے ہیں۔ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ پنکھا بند تھا اور کھڑکی کے روزن سے آئی ہوئی آخری کرن اندھیرے کی گرفت میں سسک رہی تھی۔ اس کے سانس تیز ہو گئے۔ وہ بڑی تیزی سے بجلی کے سوئچ کے پاس گیا اور ایک ہی جھٹکے میں بجلی اور پنکھے کے بٹن دبا دیئے۔ کرن مر گئی۔ پنکھے کی ہوا نے اس کے دماغ میں بھڑکتی لپٹوں کو لمحہ بھر کے لئے دبا دیا۔ اس نے کھڑکی کھول کر پنکھا بٹن بھی کھول دیا۔ ریڈیو پر ہوتے ہوئے اعلانات سنسناتے ہوئے اس کے کانوں سے گزر گئے۔ برسات کے دنوں کی خنک ہوا نے اس کے دماغ کی آگ کو پھر بھڑکا دیا۔ بجھتی ہوئی فائر بریگیڈ کی گھنٹیاں خاموش ہو گئیں۔ اس نے گھنٹوں کی آواز کی طرف دیکھا۔ مشرق کی طرف بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ سورج تو اس طرف ڈوبا ہے۔ یا سورج ابھی غروب نہیں ہوا اور میرے کمرے میں اندھیرا ابھی وقت تیز کر رہا ہے اس نے گھوم کر چھت کی طرف دیکھا۔ بلب روشن تھا ــــ نہیں، نہیں چھت سے ابھی تک کرن کا لہو ٹپک رہا ہے تو پھر صبح ہو رہی ہے۔ جو صبح ہے؟ اس کے سارے جسم کی گھبراہٹ نے آنکھوں میں آ کر سارے شہر سے سوال

گیا۔ روشنی کی طرف سے آتا ہوا شور۔ اس نے پہلی مرتبہ سنا۔ اس شور کی کئی کئی
گونجیں جنہیں اس کے کانوں نے دو لفظوں میں ایک کر دیا تھا —— صبح ہے؟
اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "تو یہ لمحہ بھی چل گیا؟" وہ چیخا۔
نیچے بازار میں قہقہے بلند ہوئے۔ اس کی نظریں آسمان سے اتر کر
بازار میں آگئیں۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے تین نوجوان کھڑے تھے۔ ان میں
سے ایک کے ہاتھ میں کھمبے کی بیمار روشنی کا عکس چمک رہا تھا۔ پھر یہ
عکس بجھ گیا۔ اور اس نے کوئی چیز اپنے ازبند کے ڈبے میں اڑس لی تینوں
پھر ہنسے اور بائیں بازار کی طرف مڑ گئے۔ اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا
ایک بہت بڑے شہاب ثاقب کی لکیر آسمان کو کاٹتی ہوئی نگاہوں کی حد
بن گئی —— نہیں، سورج طلوع نہیں ہو رہا ہے۔ —— وہ تو ابھی
ابھی میرے سامنے ڈوبا ہے۔ آسمان سیاہ ہے۔ نگاہوں کی حد پر تو اور
بھی کئی روشنیاں ہیں۔ جو کہ اندھیروں کی اپنی کرنوں سے ہیں۔ نگاہوں کی
سرحد پر شور ہے۔ اندھیروں کی کرنوں کی آمد نئی اتر رہی ہے۔ لمحے کا ماتم
نہیں۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے پھیلتے قہقہوں میں پھٹ گئے
یہ اندھیرے کی روشنی صرف موقع ہے۔ لمحہ ہے۔ اور یہ لمحہ اس وقت
تک نہیں بیت سکتا جب تک میں اس کمرے کی رگوں میں بہتی ہوئی روشنی
کو نہ بجھا دوں۔ یہ روشنی مجھ سے مین قم سے ہے۔ ان کی کرنوں کی نوکیں زہر
میں بجھی ہیں اور یہ لمحہ تو باقی ہے۔ میں اس کا بڑی مدت سے منتظر تھا۔ اب
میں یہ موقع نہیں جانے دوں گا۔

"آج تم زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے" ـــــ وہ گھوم کر چیخا ـــــ
اس کی نظریں بڑی تیزی سے دیواروں پر لگی تصویروں سے پھسلتی دروازے کے ساتھ بڑی اینل پینٹ کے ترک گئیں ـــ "سنتے ہو۔" اس نے نامکمل قدِ آدم تصویر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ "لیکن تم ابھی تک آئے کیوں نہیں؟"

تصویر کی غیر مکمل مسکراہٹ مکمل ہو گئی ـــ تمہارے سر پر موت منڈلا رہی ہے اور تم مسکرا رہے ہو؟ اس نے بڑے غصے میں پیلٹ نائف اٹھا لیا میں تمہاری مسکراہٹ بہا دوں گا۔ قتل کر دوں گا۔ وہ پاگلوں کی طرح چاقو ہاتھ میں لے کر تصویر کی طرف بڑھا۔

اس کا ہاتھ تصویر کے بالکل قریب جا کر رک گیا۔ اگرچہ تم مکمل ہو، مگر تمہارا عکس نامکمل ہے۔ جب تک کوئی چیز مکمل نہ ہو اسے ختم نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہارا اور تمہارے عکس کا اکٹھا خون بہاؤں گا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر پلیٹ اٹھا لیا۔ اور چاقو سے کینوس پر سرخ رنگ پھیلانے لگا۔

اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اور سگریٹ کا دھواں سرخ رنگ میں گھل کر اس کے گرد پھیلنے لگا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ بڑی تیزی سے کینوس پر حرکت کر رہا تھا۔ پھیلتا ہوا سرخ دھواں سمٹنے لگا۔ سمٹتا رہا۔ سرخ دھوئیں کا دائرہ تنگ ہوتا رہا۔ پھر بڑے بڑے سرخ ہاتھوں نے اسے کندھے پر اٹھا کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں ـــ میں کہیں نہیں جانا چاہتا، میرے پاس وقت نہیں، وہ کلبلایا۔ اس نے پنکھے کی طرف

دبجا۔ پنکھا کافی ہٹ کر تھا۔ اس نے پنکھا تیز کرنے کے لئے اٹھنا چاہا۔ اس کی رفتار کم ہے۔ اس نے سوچا ـــــ لیکن وقت بھی کم ہے ـــــ آج بشکل موم بھی ہے۔ اگر میں اٹھا تو لحہ پگھل جائے گا۔ بہہ جائے گا۔ اس کے پیروں میں پڑے دھوئیں کے تسمے میں کئی گرہیں پڑ گئیں۔ اس نے تنگ آ کر سگریٹ منہ سے نکال لیا۔ دھوئیں کی شکلیں مسکرا دیں۔ اس نے سگریٹ کو دبجا۔ تم میرے نہیں ہو۔ تم اس کے ہو۔ اس نے سگریٹ سے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "تم تم اور تم" اس نے سگریٹ کو پیر سے مسل کر دھوئیں سے کہا۔ "تم سب اس کے ہو، سازشی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میرے ہاتھ بندھے رہیں۔؟"

اس کی رگوں میں بہتے ہوئے دھوئیں کی سرخی پھیکی پڑنے لگی۔ آج میں اس سازش کو ختم کر دوں گا۔ اپنے جسم میں بہتے ہوئے زہریلے خون کو بدل دوں گا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر کھڑکی کے پار پھینک دیا۔ تم ابھی تک آئے کیوں نہیں؟ تمہارے آنے کے بعد میں تمہاری ایک ایک چیز کو پھینک دوں گا۔ یہ جگہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ وہ دراز سے پستول نکال کر دیکھنے لگا۔ پستول اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا ـــــ آج میرا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے۔ آج چلی ہوئی گولیوں کی بازگشت تو زنجیروں میں کو بجنے سے پہلے ہی مر جائے گی۔ اب اسے میرے ہاتھ سے نہیں پھسلنا چاہیے میں اتنا مضطرب کیوں ہوں؟ ـــــ میری یہی حالت رہی تو نشانہ کہیں چوک نہ جائے۔ اور میں پھر اندھیروں کی کروٹوں کی انی پر گھومنے لگوں۔

نہیں مجھے خود پر پوری طرح قابو پانا چاہیئے۔ —— وہ آتا ہی ہوگا

اس نے پستول میز پر رکھ دیا۔

ورنہ گولیوں کی آواز۔

اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ان پر نئے اندھیرے جل رہے ہیں

اس کی کنپٹیاں بجنے لگیں۔ آج ہر انسان کا اپنا قانون ہے اور ہر کوئی اس سے

پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور میں یہ موقع نہیں جانے دوں گا۔

اس نے پھر پستول اٹھایا اور رخ تصویر کی طرف کر دیا۔ اس کا ہاتھ

پھر کانپنے لگا۔ میں ابھی تک بوکھلایا ہوا ہوں۔ مجھے پرسکون ہونا چاہیئے

ورنہ —— ورنہ اس نے پستول رکھ دیا اور پیالی میں تھرموس سے چائے

انڈیلنے لگا —— جب وہ آئے گا تو میں مسکرا کے اس کا استقبال کروں گا۔"

وہ مجھ سے کیفے ڈی سوزا میں چلنے کے لئے کہے گا۔ تو میں ہنس کر کہوں

گا۔ ابھی چلتے ہیں۔ اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ کافی پینی ہے نا۔ پھر میں بڑی

ترکیب سے اس کے سامنے کسی بہانے پچھلے سانحے واقعات کو دہراؤں گا۔ اپنی بہترین

دوستی کا ذکر کروں گا۔ اس نے پیالی میں شکر گھولتے ہوئے سوچا۔ آہستہ

آہستہ میں باتوں کو غصے میں لپیٹتا جاؤں گا۔ لڑکی کا ذکر اس طرح کروں

گا کہ غصے میں کھولنے لگے۔ باتوں باتوں میں تلخی بڑھ جائے گی اور میں

اس پستول کے ذریعے ہر قسم کی قید سے آزاد ہو جاؤں گا۔ اس نے

شکر گھولتے گھولتے ایزل پر پڑی تصویر کو دیکھا اور مسکرایا۔ ابھی جب

تم آؤ گے تو تم نہیں ہو گے۔ اب میں خود پر کافی قابو پا گیا ہوں۔ پیالی

اٹھاتے ہوئے اس کی نگاہیں پیالی میں چائے کے بھنور میں آ گئیں۔ اس نے دیکھا کہ بھنور میں اس لڑکی کی پرچھائیں گھوم رہی ہے کیا مصیبت ہے۔
اس نے سوچا —— میرا تصور مجھے ڈبو دے گا۔ —— تمہارا تصور تمہیں لے ڈوبے گا۔ اس کے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی خواہ مخواہ ہر وقت نہ سوچا کرو —— اس کے دوست کی آواز آئی تم بہت IMAGINATIVE ہو۔ کیفے والا ڈبی سوتا مسکرایا —— تمہارا تصور تمہیں لے ڈوبے گا۔ لڑکی نے بھنور سے کہا —— لے —— ڈوبے —— گا —— لے —— ڈ —— و —— بے —— گا —— ا —— ا —— ا —— اس کے کانوں میں بازگشت کی بازگشت تھی۔
"تم کہاں ہو؟" —— وہ بھنور کے کنارے پہنچا۔
"وہ تم سے پہلے اس پاتال میں اتر گئی ہے۔" بھنور میں اس کے ہونٹوں نے اس سے کہا۔
"کس کے ساتھ؟ میں تو یہاں ہوں"
"تمہارے دوست کے سر پہ سانپ کا تاج ہے اور لڑکی کے سینے پر بائیں طرف دانتوں کے دو نشان ہیں۔ دل سے سنہری خون بہہ رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں زہر بجھا خمار ہے۔
"کہاں ہیں دونوں؟"
"پاتال میں —— تاج کے سانپ کو دودھ چاہیئے۔
"میں اس سانپ کو کچل دوں گا۔ اس نے بھنور میں چھلانگ لگا دی

چھنن ۔ ٹن ۔ ٹن ۔ پیالی فرش پہ گر کے ٹوٹ گئی چھنن ۔ چھن چھن چھن
زنجیروں کا شور ـــــ وہ اٹھ کر بے قراری سے ٹہلنے لگا ۔ اس کی
نگاہیں دیوار پر جنگل کی تصویر میں بھٹک رہی تھیں ۔ وہ ۔ اس کا دوست
اور لڑکی جنگل میں بکھرے تھے ۔ چھن چھن ۔ اس زنجیر کو اتار دو ۔ اس نے
لڑکی کے پیروں کی طرف اشارہ کیا ۔ اس کا دوست تاج کے سانپ
سے کھیلتا ہوا مسکرا دیا ۔ یہ سونے کی ہے ۔ سنو ۔ یہ تمہارے پیچھے
پیچھے جائے گی ۔ اگر تم نے مڑ کر اسے دیکھ لیا تو تم اسے کبھی نہ پاؤ گے
اس نے جنگل کی تصویر کو گھورتے ہوئے سوچا ۔ اگر مڑ کر پیچھے
دیکھنے سے چیزیں غائب ہو جایا کرتیں تو آج میرے پیچھے کچھ نہ ہوتا ۔
اس نے ہمیشہ مڑ کر پیچھے دیکھا تھا لیکن وہاں سب کچھ ہوتا تھا ۔ ایک ایک
نقش ـــــ ایک ایک آواز ـــــ زنجیر کی آواز آتی آتی بالکل بند ہو گئی
تھی اور پیچھے اور دور ـــــ اور دور ـــــ اس مرتبہ اس نے گھبرا کے
مڑ کر دیکھا تو لڑکی وہاں نہیں تھی ۔ خلا تھا ۔ کوئی راستہ نہیں تھا ۔ وہ جنگل
میں تھا اور ہر قدم راستہ تھا ۔ جنگل اور خلاء کے درمیان سونے کی
زنجیر پڑی تھی ۔ ”تم فریبی دوست ہو ۔“ اس نے زنجیر اٹھا لی ”میں
اسی سے تمہیں پھانسی دوں گا ـــــ قتل کر دوں گا ـــــ میں تمہیں
نہیں چھوڑوں گا ـــــ نہیں چھوڑوں گا ۔“ وہ جنگل کے زنداں میں
پاگلوں کی طرح گھومنے لگا ۔ ہر قدم راہ پر تھا ـــــ اور ہر راہ نئی سلاخ
کی طرف جاتی تھی ـــــ میں تمہیں فنا کر دوں گا ۔ وہ دھاڑا ـــــ میں تمہیں

دانتوں میں پکڑ کے جنگل میں گھسیٹتا پھروں گا۔ اور جب تم سسک سسک کر مر جاؤ گے تو میں پھاڑ کر کھا جاؤں گا۔ اس کی ہنسی سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ اس کی انگلیاں زنجیر کو بری طرح ہاتھوں میں مسلنے لگیں۔ اس کی نگاہیں سارے جنگل میں گھومتی میز پر پڑے پستول پر جا پڑیں۔ اس نے ایزل کی تصویر کو دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو سرخ رنگ کی ٹیوب اس کے ہاتھ میں بری طرح پچکی گئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔ "آج میں تمہاری موت کے بعد بھی نہیں مروں گا۔ آج اس قسم کا کوئی قانون نہیں ہے کہ انسان دوسرے کے مرنے کے بعد زندہ نہ رہ سکے۔ آج میں آزاد ہو جاؤں گا"

"تم میں اتنی ہمت ہے؟ تم مجھے قتل کر سکتے ہو؟"

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر تصویر کو۔ "کیوں نہیں میں اس وقت بڑا پرسکون ہوں۔"

"میرے مرنے کے بعد اپنے دلوں کی قیمت کہاں سے دو گے؟"

"آج کے بعد میں نیا آدم ہوں گا۔"

"پیچھے مڑ کے دیکھنے پر تمہیں صرف زنجیر ملے گی۔"

"بکو نہیں۔"

تصویر ہنسی۔

"میں تمہیں مسخ کر سکتا ہوں۔" وہ دھاڑا۔ اور ہاتھوں کا سرخ رنگ اس پر پھیر دیا۔

"لیکن میں مٹا نہیں۔"

کھڑکی سے ایک بار اور گولیوں کی بوچھاڑ کی آواز آئی۔ اس نے لپک کر میز پر پڑا پستول اٹھا لیا ـــــ یہ دیکھو میرا ہاتھ کانپ نہیں رہا۔ میری اتنی مضبوط گرفت تو برش پر بھی کبھی نہیں ہوئی ـــــ وہ ہنسا۔ اب لمحہ میری مٹھی میں ہے۔ اب تمہارا نام و نشان بھی نہیں رہے گا ـــــ رہے گا۔ نہیں رہے گا ـــــ رہے گا ـــــ وہ پستول کا رخ اس کی طرف کر کے دائیں آنکھ کی سطح پر لایا ـــــ کس طرح نہیں رہے گا ـــــ

" کیا تنہا ہنستے رہتے ہو ـــــ تمہیں خود کلامی کی بہت بری عادت پڑ گئی ہے۔ "

وہ اور بھی زور سے ہنسا۔

"چلیے کافی پی آئیں ـــــ کیا کر رہے ہو۔ یہ پستول ـــــ کیا کر رہے ہو ـــــ اس کا رُخ ـــــ کیا کر ـــــ "

" آزادی حاصل کر رہا ہوں۔ " اس کے قہقہے پستول سے نکلتی گولیوں کی آواز پر چھا گئے۔

" مے ـــ رے ـــ دو ـــ دو ـــ ست " آواز زمین پر پھیلتے ہی سرخ رنگ میں ڈوب گئی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے پستول اس کے سینے پر پھینک دیا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کمرے سے نکل کر بازار میں آ گیا۔ آج کافی کا مزہ نیا ہو گا۔ وہ کیفے ڈی سوزا کی طرف چلنے لگا ـــــ میں نے اب جنم لیا ہے۔ اس لئے بازار سے اپنے کمرے پر آخری نگاہ ڈالی۔ اگر یہ

لمحہ بھی گزر جاتا۔ تو میں اس کوٹھ میں ہمیشہ قیدی بنتا۔ اب میری زندگی کا ہر لمحہ میرا اپنا ہے۔ اب کسی پل پر بھی اس کی مہر نہیں ہوگی۔ اب میں سر اونچا کر کے چل سکتا ہوں پہلے میری گردن پر اس زنجیر کا بوجھ تھا اور اب ——— وہ اور بھی گردن اکڑا کر مسکرایا۔ اگر میں اس روز اسے قتل کر دیتا۔ جس دن میری گردن پر اس زنجیر کا بوجھ تھا اور اب ——— وہ اور بھی گردن اکڑا کر مسکرایا اگر میں اس روز اسے قتل کر دیتا، جس دن میری گردن جھکی تھی تو میں آج سے بہت پہلے آزاد ہو گیا ہوتا۔ لیکن تب ——— تب کون کہہ سکتا ہے کہ میرا ہاتھ نہ کانپتا۔ یا بعد میں میرے پیروں میں بیڑیاں نہ ہوتیں۔ لیکن آج میں بڑی آزادی سے گھوم رہا ہوں اور میرا ہاتھ بالکل نہیں کانپا؟ اس نے بجلی کے کھمبے کے نیچے سے گزرتے ہوئے اپنا ہاتھ دیکھا۔ سرخ رنگ اب بھی لپٹا ہوا تھا۔ اور ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر مڑ کر دیکھا۔ اس کے گھر تک روشن بلبوں کی زنجیر خلا کو چیرتی چلی گئی تھی۔ اس نے پھر اپنا ہاتھ دیکھا اور فوراً دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا ——— میرا نشانہ ——— وہ مرا بھی یا نہیں اسے مرنا چاہیے وہ مر گیا ہوگا۔ لیکن میرا ہاتھ ——— مجھے جلدی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ کیا معلوم اسے گولی لگی بھی یا نہیں "لیکن میں مٹا نہیں"، اس کی آنکھوں میں تصویر مسکرا دی۔ لیکن زمین پر تو لال لال رنگ تھا، وہ، وہ ——— اس نے پھر اپنے سرخ ہاتھ کو دیکھا ——— نہیں۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں مسکرا کے اس کا استقبال کرتا۔ جب وہ مجھ سے کہنے چلنے کے لئے کہتا تو میں اسے سمجھاتا کہ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کافی ہی پیتا

ہے۔ پھر میں باتوں باتوں میں اسے غصے میں پاگل کر دینا۔ خود پاگل ہو جانا
پھر پورے اطمینان اور اعتماد سے اسے گولی مار دینا۔ لیکن میں اس
سارے عمل سے پہلے ہی پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس کے سیڑھیاں
چڑھنے کی آواز آتی تھی جو کمرے میں آکر بند ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن
میں قدموں کی آواز گونجنے لگی۔ ہاں وہ آیا تھا ——— سنسان بازار میں اس
کے اپنے بوٹ چیخ رہے تھے۔ وہ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر تصویر
کے پیچھے چھپ گیا ہو گا ——— اور اب، اور اب ——— بوٹوں کی آواز
اس کے دماغ پر برسنے لگی۔ ——— ٹھک ——— ٹھک ——— ٹھک۔ اس
نے کنپٹیاں دبا کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر چلتے ہوئے اپنے پیروں
کو دیکھا ——— نہیں میرے بوٹوں کی آواز اتنی نہیں ہو سکتی۔ وہ میرا پیچھا
کر رہا ہے ——— تصویر کے پیچھے سے نکل کر آ رہا ہے۔ اس کے قدم
تیز ہو گئے۔ وہ مجھے پکڑ لے گا۔ اور پھر ——— اور پھر میں ساری عمر ———
اس کے قدم تیز ہو گئے۔ ہر مکان کے بند دروازوں سے بوٹ
چرچراتے ہوئے اترنے لگے۔ دوڑو ——— پکڑو ——— یہ قاتل ہے۔
قدموں کی آواز اور تیز، اور تیز ——— اور نزدیک اور قریب۔ دوسرے
کھمبے کے قریب سے گزرتے ایک سایہ اس کے پیچھے سے نکل کر اس
کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے نہ پکڑو۔ میں نے
قتل نہیں کیا۔ میرا ہاتھ کانپ گیا تھا۔ لمحہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا ہے
یہیں رہیں۔ تم۔ تم۔ اس نے گھبراہٹ میں چلتے چلتے پیچھے گھوم کر

دیکھا۔ سایہ اس کے ساتھ چل کر آگے بڑھ گیا تھا۔ پیچھے کچھ نہیں تھا۔ زنجیر بھی نہیں۔ دور تک کھمبوں کی قطار اونگھ رہی تھی۔ مکانوں میں سناٹا تھا۔ تاریکی تھی۔ اکا دکا مکانوں کے ایک آدھ کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ سارا بازار خاموش تھا۔ کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ یا دور نیم جان سا شور۔ یا فائر بریگیڈ کی دم گھٹی گھنٹیاں۔ نہ جانے محلے کے کتے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رکا اور اس کے کان کسی بھی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگے۔ اور اس کی نظریں کسی بھی جاندار چیز کو تھڑوں تک کے نیچے ڈھونڈتی ناکام لوٹ آئیں۔ تم نہیں ہو اس نے سوچا۔ ورنہ یقیناً تم میرا پیچھا کرتے۔ گویاں چیر کے تم سے زندگی چھین لے گئی ہوگی۔ ورنہ اگر تم میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو کم از کم چیخ پکار تو ضرور کرتے۔ پھر میں نے تمہیں خود گرتے دیکھا تھا۔ میں بھی خواہ مخواہ اپنے تصور کے بہاؤ میں آگیا۔ وہ مسکرا دیا۔ اور آج تو میرا ہاتھ کانپ ہی نہیں سکتا تھا۔ آج تو کسی کا بھی ہاتھ نہیں کانپ سکتا تھا۔ وہ مکان پہ نظریں دوڑاتا ہوا چلنے لگا۔ یہ سب لوگ بھی تو گھروں میں نہیں ہیں۔ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے گئے ہیں۔ یہی اپنی گولیوں کی پیاس بجھانے گئے ہیں۔ کتوں کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ آج قانون زندگیوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک نہیں رہا اسی لئے مجھے خود پر اعتماد تھا۔ میں نے تمہارے خون میں تمہاری آواز غرغراتی سنی تھی۔ مجھے یاد ہے تصور نے کہا تھا میں مٹا نہیں اور میں نے تم دونوں کو اکٹھا مٹا دیا تھا۔ میرے

پستول کی نالی اب بھی بارود کے دھوئیں میں ملی تمہارے خون کی بو ہو گی وہ مسکرایا۔ وہ پستول میرا نہیں ہے۔ یقین جانو میں نے تم کو قتل نہیں کیا تم نے خود کو قتل کر دیا ہے۔ یا پھر تمہیں وہ لوگ مار گئے ہوں گے جو اندھیروں کی لو کو اونچا کر رہے ہیں۔ میں نے پستول کا گھوڑا نہیں دبایا تھا۔ میں نے تو صرف ریت گھڑی کے سوراخ پر انگلی رکھی تھی۔ گرتی ہوئی ریت بند کی تھی۔ وقت کو خاموش کیا تھا۔ جانے گھڑی کا شیشہ کس نے توڑا ہے۔ اس کے ہونٹ عیارانہ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ میں نے تو صرف سلے کی موم کو منجمد کیا تھا۔ تم قتل ہو گئے ہو۔ بیچ بیچ۔ ہوا کی گرہ بھی کھل گئی۔ میں بھی آزاد ہو گیا۔

وہ کیفے کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ کیفے کا مالک دروازے کے سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا کیش گن رہا تھا۔ اس کی آہٹ سے یکدم چونک کر اس نے نوٹ دراز میں رکھ کر فوراً چابی گھما دی۔ پھر اسے دیکھ کر اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی۔ "او"

"ہیلو"

"ادھیمین۔ تم ادھر کیا کرتا۔ سائرن بجنے والا ہے۔"

"کافی پیئوں گا" ——— وہ مسکرایا۔

وہ اس سے ہاتھ ملا کر اس کے لئے سامنے کی میز والا پنکھا چلانے لگا کہ اس کی نظریں اپنے ہاتھ پر جم گئیں۔ ——— "بلڈ ——— تم۔ تم بھی آج۔"

وہ گھبرا گیا۔ "ہاں ـــ نو ـــ نو ـــ نہیں ـــ یہ ـــ تو۔"

"گوش۔ یو ڈیم آرٹسٹ۔ پینٹ کرنے کے بعد ہاتھ تو دھو لیا کرو۔"

"شکریہ" اس نے رومال سے پسینہ پونچھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ "کافی"

"سائرن بجنے والا ہے؟ تم آج بھی نہیں سوؤ گے۔؟"

"اوسویٹ انکل" ـــ وہ ہاتھ دھونے لگا۔

"یو ـــ آرٹسٹ"

وہ دروازے کی سامنے والی میز پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں خوف نہیں آتا۔" وہ باورچی خانے سے بولا۔ "ریڈیو سنا تھا۔؟ انارکی ہے۔"

"تو ـــ؟"

"تمہارا کوئی دشمن نہیں؟ ـــ کوئی تمہیں قتل کردے تو؟"

وہ باورچی خانے سے ٹرے میں کافی وغیرہ لے کر آگیا۔ "اں؟"

وہ ہنسا۔

"نو ـــ نہیں۔ اب میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔" ـــ وہ مسکرایا

"ارے تمہارا وہ فرینڈ کدھر ہے۔؟ ـــ نہیں آیا؟"

"میرا دوست۔" وہ کافی کی پیالی اٹھاتا ہوا ہنسا۔ "وہ وہ"

اس کی نظریں دروازے سے باہر جم گئیں۔ اور اس کے ہاتھ سے

پیالی چھوٹ گئی۔ اس کا دوست سامنے سڑک پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جہاں اس کا دوست کھڑا تھا اور باہر سڑک پر آ گیا۔

وہ کیبنے میں پہنچا۔ "ادہ مین — سائرن بج رہا ہے اندر آؤ۔ تم کیا کر رہے ہو۔"

وہ اس جگہ رک کے کھڑا ہو گیا، جہاں اس کا دوست مسکرایا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، ہر طرف اندھیرے میں بس ایک سایہ تحلیل ہوتا نظر آتا تھا۔

سائرن بج رہا ہے۔ بلڈی فول۔ کم ان۔"

موٹر مڑ کر سامنے سے آتی ہوئی روشنی نے یکلخت اسے اندھا کر دیا۔ ہارن۔ سائرن۔ ہارن۔ سائرن اور کیبنے کا مالک اسے عین جیپ کے سامنے سے گھسیٹ کر کیبنے میں لے آیا اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ "مدہبڑ مین۔"

اس نے ہاتھوں سے آنکھیں مل کر شوکیس سے باز ار میں دیکھا پھر اس کو اور پھر میز کو۔ پیالی اوندھی پڑی تھی اور میز کے کنارے سے پگھلی موم کے لمبے بڑی تیزی سے ٹپک رہے تھے۔
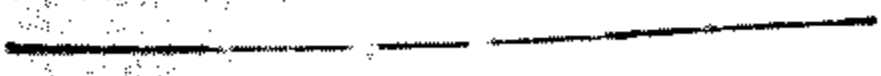
چوراہا

یہ دو سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہیں اور

ہیں۔

اس نے بس اسٹینڈ کے چھجے سے اپنی کہنیاں ہٹائیں اور فٹ پاتھ

پر بیٹھ گیا۔

اور ہیں، اچھا تو جس جگہ پر یہ سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی آگے بڑھ

گئی ہیں یہ ان سڑکوں کے دونوں طرف گڑھے ہیں اور یہ بے چارے

فٹ پاتھ زمین کے چہرے پر اداس لکیریں یہ بس کب آئے گی۔ دور دور

تک کوئی نظر نہیں آتا۔ میں سینما سے تانگہ پکڑ لیتا تو اچھا تھا۔ بس اسٹینڈ پر

تو اس وقت کوئی بھی ——

اس نے سر گھما کر دیکھا۔

یہ ابھی کون گزرا تھا۔

اس کی آنکھوں میں روشن سایہ لپکا۔

لاحول ولا، یہ تو میری سیاہ پلکوں پہ کرن لرزی تھی۔ نہیں یہاں کوئی نہیں اور بس نہیں آئے گی۔ لیکن سینما کا آخری شو دیکھنے والوں کی سہولت کے لئے رات کے وقت اسپیشل بسیں بھی تو چلتی ہیں۔ پر جانے اس روٹ پر بس آتی بھی ہے یا نہیں۔

اس کی نظریں دونوں سڑکوں پر چلتی ہوئی عین درمیان میں آکر رک گئیں وہاں سپاہی کا چبوترہ تھا اور اس کے بالکل اوپر پیلی روشنی کا ہالہ۔ یہ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ یہ علیب کا وہ حصہ ہے جہاں۔

نہیں نہیں

اس نے فوراً اپنی آنکھیں وہاں سے ہٹا لیں۔ اس کی نظروں کی چھپکلیاں کھمبوں کی روشنی میں رینگنے لگیں۔

کوئی نہیں۔ کچھ نہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے کیا۔

اندھیاریوں میں ابھرتی چٹانوں پر چڑھنے لگیں۔ کھڑکیوں میں اٹک اٹک کر۔

اندر کیا ہو رہا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پر میں تو ابھی ابھی سینما سے اپنا پیٹ بھر کر آیا ہوں۔ ہم کتنے ملبہار ہے ہیں

عمارتوں کی چھت سے اس نے دیکھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ اس نے جب ۱/ تنے برہنہ کہ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ آخر میں یہاں کیوں بیٹھا ہوں۔ بھئی مجھے جانا جو ہے کہاں گھر اور کہاں ادھ یاں

گھر۔ لیکن میرا گھر کہاں ہے۔

وہ اپنے سوال سے پریشان ہوگیا۔ اس نے چاروں اطراف جواب ڈھونڈا اس کی نگاہیں فٹ پاتھ سے ذرا ہٹ کر پڑی کنکریوں کی ڈھیریوں میں پھنس گئیں کنکریاں برہنہ ستاروں کا عکس تھیں۔

یہ ہر شے مجھے ننگی کیوں نظر آرہی ہے۔ کیوں نہ آئے تم صحیح لفظ کا استعمال جو کر رہے ہو۔ ہر شے اصل میں ننگی ہے اور یہ ننگا بھی کتنا ننگا لفظ ہے۔ اسے ہنسی آگئی۔

میں نے لفظ کا کتنا خوبصورت جال بُنا ہے۔

اور پھر فوراً ہی اس کے حلق میں دفن ہوگئی۔ فراٹے بھرتی ہوئی کار زوں سے اسے اندھا کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اور عین اس جگہ پر، کار میں سے کسی نے جلتا ہوا سگریٹ پھینکا تھا۔ جہاں سپاہی کا چبوترہ تھا۔

دیکھو سگریٹ بھی کیسا عین چبوترے پر آن کے جا ہے سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی آگے بڑھ گئی ہیں۔ اور یہ صلیب کا وہ حصہ ہے جہاں کہ سر وہ مسکراتا مسکراتا رہ گیا۔ کہیں گھڑیال نے ایک بجایا۔

ایک بجا ہے۔ ساڑھے بارہ ہوں گے۔ نہیں ایک نہیں ڈیڑھ میری بلا سے جو بھی بجا ہے میں نے تو وقت کی سرگوشی ہی سنی ہے جو ماضی کی ہوتی ہے۔ مستقبل کی بس ایک ساکت لمحہ ہوتا ہے جو تنہا ہی چلا جاتا ہے لیکن جو کچھ بھی بجا ہے کمبخت گھڑیال بجانے بھی چلا جا رہا ہے۔ محض تنہا ہی چلا جا رہا ہے، یا یہ بازگشت ہے، جس کا دائرہ خود ہی اپنے گرد کھینچ رہا ہے اور پھر اس میں گرفتار ہو رہا ہے۔ میں اٹھ کر چلا کیوں نہیں جاتا۔ یہ لفظوں اور آوازوں کی سازش ہے

گھرر گھرر گھرر ررررررررررر۔
بھئی مجھے معلوم ہے کہ بس اس وقت نہیں آئے گی

رررررررر

اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے معلوم نہیں مجھے کس سڑک سے گھر جانا ہے۔

رررررر

یا کونسی سڑک میرے گھر کو جاتی ہے۔

پیں، پیں، پیں، پیپ۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ پیلی چھت والی سیاہ کار کھڑی تھی۔

کبھی تو یہ ٹیکسی والے حرامی باپ کی نہیں سنتے "صاحب ہم کیا کریں۔ مالک کہتا ہے کہ شام کے وقت اگر چالیس نہ دیجے تو "صاحب یہ امپیٹی پڑ جاتی ہے۔" "صاحب۔ ہم مجبور ہیں" ۔۔۔ وہ کون مجبور نہیں ہے۔ زمین کے ذرے ذرے سے لے کر آسمان ۔۔۔ میں پھر بہکنے لگا ہوں۔ میں اس وقت بالکل مجبور نہیں۔ اگر چاہوں تو یہاں سے جا سکتا ہوں تو پھر میں اٹھتا کیوں نہیں۔

"صاحب چلے گا" اور کبھی یہ ٹیکسی والے آپ کو کہیں نہ کہیں چھوڑنے پر بضد ہو جاتے ہیں۔

"صاحب" ٹیکسی والے نے کھڑکی سے پھر کہا۔

رات بالکل چپ تھی۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ سوائے

کو ہٹ کر وہاں سے پانچویں کھمبے کے اندھیرے میں دو سائے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس نے جانے کس خوف سے کانپ کر ادھر ادھر دیکھا۔

آس پاس آدم نہ آدم زاد ۔۔۔ صاحب ۔۔۔ اس ڈرائیور کی نیت تو ٹھیک ہے۔ اس کی شکل تو دیکھو پیچھے کو لٹکی ہوئی۔ خوفناک مونچھیں اور آنکھوں میں سرخی قاتلوں ایسی۔ یہ قاتل ہے۔ میں اکیلا ہوں کہیں یہ مجھے ؟

"کیوں صاحب ؟"

اس نے فوراً ڈرائیور کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور حلق میں زور زور سے دھڑکتے دل کو نگل کر پرے دیکھنے لگا۔

"توڑ دو" اس نے غصے میں کار کا گیئر لگایا اور رواں ہو گیا۔ اس نے دور تاریکی میں ڈوبتی کار کی سُرخ روشنی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ یہ مجھے قتل کیوں کرتا۔ میری جیب میں اس وقت فقط دو روپے ہیں اگر وہ مجھ سے مانگتا تو میں اسے دے دیتا۔ بعض وقت ہم یونہی ایک دوسرے سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا تو ورنہ لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو میں اسے اس وقت .... یہاں یوں اکیلا نہ بیٹھا ہوتا۔

سڑک کے کنارے ایک کتا کسی گہری سوچ میں ڈوبا خراماں خراماں اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے فٹ پاتھ کے کنارے سے جھک کر ایک

کنکر اٹھایا اور پوری قوت سے کتے کی طرف پھینکا۔ کنکر سڑک کے کنارے سے ٹکرا کر دوسری سمت کو اُڑ گیا اور ساتھ ہی اس کی نظریں بھی۔۔۔۔

اچھا تو یہ کنکر یاں اس لئے یہاں پڑی ہیں کہ ایک نئی۔

نہ ہاں کنکریوں کی ڈھیریاں پڑی تھیں۔

نہیں یہ ضروری تو نہیں کہ نئی سڑک بن رہی ہو اور نہ پھر یہاں جگہ کہاں ہے۔ سڑک کی تارہکی میں اسے اور کوئی راستہ تو نظر آتا نہیں۔ شاید یہ سامنے کا خلاء ان عمارتوں کے درمیان ہیں کچھ نظر نہیں آتا۔

اگرچہ کتے کو وہ پتھر نہیں لگا پھر بھی وہ اپنی پچھلی ٹانگ اٹھا کر چیختا چلاتا ہوا بھاگ گیا۔ وہ مسکرایا۔۔۔۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔

یونہی چیخ رہا ہے۔ کم بخت۔ یہ اپنی مدافعت میں چیخ رہا ہے۔ یا اپنے ساتھیوں سے اپیل کر رہا ہے ہی ہی ہی یہ میری اپنی ہنسی کی آواز ہے۔ آواز جو کتے کی چیخوں سے ابھری ہے۔ آواز سے آواز نکلی ہے اگر ٹیکسی والے کے جانے کے بعد یہ آواز نہ نکلتی تو گھڑیال کی بازگشت کبھی مجھے لیکن لیکن بازگشت کا حلقہ تو میرے گرد اور بھی تنگ ہو گیا ہے۔ اس حلقے کی سامنے کی دیوار ساکت ہے اور پچھلی دیوار مجھے اس جگہ کی طرف دھکیل رہی ہے۔ جہاں جہاں اس نے اپنی جیبوں میں ماچس ڈھونڈی اور پھر مایوسی میں سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ڈالتے ہوئے اپنا ہی کھوجو نرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔

سگریٹ ابھی تک سلگ رہا ہے۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔

اس نے زبردستی اپنی جیب سے ہاتھ نکال لیا۔
میں اس سگریٹ سے اپنا سگریٹ نہیں سلگاؤں گا۔ او گاڈ اب میں اس طرف نہیں دیکھوں گا۔ میں اس جگہ کے کس قدر قریب آگیا ہوں۔ جہاں شہر ایک طرف کو یوں لٹک جاتا ہے، جیسے جیسے افوہ میں یہاں سے اٹھ کیوں نہیں جاتا۔ میں یہاں سے کیوں جاؤں کیسے جاؤں۔ یہ میرا شہر ہے یہ میرا گھر ہے۔ میرا گھر نہیں میری رہائش گاہ
"گھر"
لفظ آواز یہ آواز میرے غم کی آواز ہے۔ اس لفظ کی ادائیگی میں میرا دکھ ہے۔ میں احمق بچہ ہوں اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے سے میں نے اپنا دکھ وابستہ کیا ہے۔ اور اب یہ گھر تقبل لفظوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میری رہائش گاہ۔ میرا شہر۔
نہیں میں اس طرف نہیں دیکھوں گا۔
میرا شہر میں ہوں اور میرے پیچھے خفیہ پولیس ہے جو ہر لمحہ ہر آن مجھ پر میرا پیچھا کر رہی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں اپنے لئے رو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہیں وہ میرے ماتھے پر لیبل چسپاں نہ کر دیں۔ ش ہ اور ران تین کا نوں کا تاج میں نے سر پر پہننے کی بجائے بغل میں چھپا رکھا ہے۔ جسے نکالنے کے لئے وہ شلوار وں میں چوہے چھوڑ دیتے ہیں اور پلاس سے ناخن کھینچتے ہیں اور آخر مجھے سانس کیوں نہیں آرہا۔

فی امان روشنیاں جگمگاتی ہیں اور تاریک چوکھٹوں میں فریم شدہ راتوں کے درمیان دم توڑ دیتی ہیں۔ شام رات آئی۔ رات آئی اور بھنگی، چرسی، افیمی شرابی۔ کاک روچوں کی طرح اندھیرے میں نکلتے ہیں اور روشنی میں آتے ہی پھر غائب ہو جاتے ہیں، لوگ اتنے سارے لوگ سب کے سب اپنے اپنے ہونٹ چوستے ہوئے رونے کی کوشش کرتے ہیں اور تنہا بستروں میں جاکر ایکسٹر سوں کے سامنے ہمبستری کرتے ہیں۔

او گاڈ یہ میں کانٹوں کا تاج ہے اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔

میرے سامنے یہ تاج نوجوان چہرے کی ہڈیوں میں پگھل گیا ہے۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گالوں پر فٹ پاتھ پر لکیریں اور منہ میں جھوٹ کی خاموشی کا پتھر اگر میں نے منہ سے کوئی لفظ نکالا تو یہ پتھر بن کر ہر سر کو زخمی کرے گا۔ لیکن میں سقراط ہوں اور میرا دل اس وقت صاف خون پمپ کرے گا جب میرے بیلے مین ان سڑکوں پہ مجھے نیلام کرنا چھوڑ دیں گے۔ کمبختوں نے مجھے بوا سیر کر دی ہے۔

لاحول ولا اتنی لمبی سوچ اتنی خود کلامی نہیں۔ اب میں کچھ نہیں سوچوں گا۔ ہوں تو وہاں سامنے او نہوں جب بھی میری آنکھیں سیاہی کے چوتڑے سے اترتی ہیں تو میرے ذہن کو کون سی لفظیں دے دیتی ہیں اور یہ کان میرے خیالوں کی آواز کو گھڑیاں کی بازگشت کے دانتوں میں کیوں دے دیتے ہیں۔

اس نے فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے سر کے جھٹکے سے اپنے ہر خیال کو

میں سخت بور ہو گیا ہوں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گیا ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن مجھے ہر رات کی طرح ان ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی سڑکوں ہی سے کسی ایک کے گھر جانا ہوگا۔ مجھے اب اٹھنا چاہیئے۔ لیکن لیکن یہ وقت کا طوفان مجھے نکلنے بھی تو دے۔ مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہے۔ اب مجھے اس سگریٹ سے اپنا سگریٹ سلگا لینا چاہیئے۔ یہ کیا یہ یہ چاک سے بنا چہرے کا خاکہ روشن کیوں ہو گیا ہے اوہ نو۔

اس نے وہاں سے اپنی نظریں ہٹانا چاہیں، پر جیسے وہ روشنی کا حصہ بجلیں۔ علقے کی پچھلی دیوار سے اور بھی تیزی سے اسے اس چبوترے کی طرف دھکیلنے لگی۔ اس نے فٹ پاتھ سے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا۔

میں اسے کچل دونگا۔ ریزہ ریزہ کردوں گا۔

اور بڑی تیزی سے چبوترے کی طرف بڑھا۔ چبوترے پر چڑھتے ہی اس کے ہاتھ سے پتھر چھوٹ کر چبوترے پر جا گرا۔۔۔ "روشنی" وہ چیخا۔ روشنی میں اتنی روشنی میں اندھا کیوں ہو گیا ہوں۔

"روشنی۔" اس نے پھر چیخ کر کہا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ "روشنی" اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کشکول بنایا اور آسمان کی طرف بڑھایا۔

تم نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ کیوں کیوں چھین لیا کہ میں اپنے بستر میں سکون کا ایک سانس آخری سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اور میں بینائی کھو کر کھردری سڑکوں کی اس صلیب پر لٹکے ہوئے سر کو ٹٹول رہا ہوں۔ میرے دماغ۔ میرے دل۔ میرے ہاتھوں کو دیکھو۔ مجھے وہ چیز دے دو

سانحے اسے میں ہول میں پھینک دیا۔

جاؤ سالگرہ میں اور مجھے خوش رہنے دو۔

اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر سگریٹ نکالنے کے لئے پھر جیب میں چلا گیا اس کی آنکھیں پھر اس جگہ کی طرف اٹھ گئیں، جہاں!

اور خدا یک کیا سگریٹ تو خیر جل ہی رہا ہے۔ یہ سگریٹ کے گرد چہرے کا خاکہ کس نے بنایا ایک طرف کو جھکے ہوئے سر کا خاکہ نہیں نہیں یہ پہلے ہی سے بنا ہوگا۔ کسی شرارتی بچے نے سکول سے لوٹتے وقت کلاس روم سے چرائے ہوئے چاک سے دیوار پر گالی نہ لکھی تو چیونٹے پر یہ چہرہ بنا دیا۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔

ہاں تو میں پھر کچھ سوچنا چاہتا ہوں —— نہیں میں کچھ نہیں سوچوں گا وہ رہی وہ سائے کھمبے کی تاریکی سے نکل کر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ دو ایک بار اس کی حد نگاہ میں آئے بھی تھے۔ لیکن جانے کیوں اس نے ان پر غور نہیں کیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج کی فلم میں ہیروئن نے کپڑے اتارے تھے تو اسے انگیا میں بھینچے سینے اور گدرے جسم کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اسے ان سایوں کے قدموں کی چاپ سنائی تو دیتی تھی۔ لیکن اس نے اس منظر کی بیک گراؤنڈ موسیقی پر بھی تو غور نہیں کیا تھا۔

نہیں میں کچھ نہیں سوچوں گا۔

اس نے سوچا۔

مجھے اپنا ہاتھ دے دو ——————— دو اور مجھے میرے گھر لے جاؤ۔ محفوظ جگہ لے جاؤ۔ میرے سر پر تین کا نوٹوں کا تاج ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں، تنگ آ گیا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے راستہ دکھا دو آئندہ میں اس جگہ کبھی نہیں آؤں گا۔ کبھی نہیں۔

اس کی نظریں آسمان میں گڑی تھیں۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔ التجا تھی۔

مجھے اپنا ہاتھ دو نہیں؟ —— اچھا۔

اس کا چہرہ یک لخت درشت ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ گرا دیئے۔

نہیں اچھا تو نہ سہی۔

اس نے بڑے غصے میں اپنے ہاتھوں میں دیکھا۔

تم اوپر کیوں اٹھے تھے۔ کیوں کیوں کیوں ہیں۔ تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس نے جوہڑ کے پر پڑا پتھر اٹھایا اور زور زور سے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارنے لگا۔

میں اب کیل ٹھونک کر تمہیں یہاں لٹکا دوں گا۔ غدار کہیں کے۔

اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ "ارے باؤ جی —— یہ کیا کر رہے ہو؟"

اس نے خالی آنکھوں سے دیکھا۔ وہی دو آدمی کھڑے تھے۔

"پہلے تو تم نے یہ اوپر والی بتی اتارنے کی کوشش کی —"

"جی — اوپر والی بتی — سیڑھی کے بغیر تو وہاں ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔" — اس نے حیرانی سے کہا۔

"اور پھر تم یہ چبوترہ توڑنے لگے۔"

"چبوترہ ؟"

"تم کون ہو بابو جی ؟"

"ہیں —" اس کی سمجھ میں نہ آیا — وہ دونوں کیا کہہ رہے ہیں

"شرابی معلوم ہوتا ہے۔"

"بو تو نہیں آ رہی —" دوسرے نے کہا۔

"بکو مت۔ بو کا آنا ضروری نہیں۔" پہلے نے اپنے ساتھی کو ٹھوکا دیا۔

"ہاں ہاں — میرا مطلب ہے کہ بالکل شرابی۔ — چلو بابو ہمارے ساتھ ذرا تھانے تک —"

"بھائی میں شریف آدمی ہوں — ہیں —"

"شریف آدمی رات کے ڈیڑھ بجے شراب [illegible] پھرتے۔"

"لے چلو جی تھانے۔"

"مگر سنتری جی —"

"ہاں ہم نے ابھی ابھی تمہیں خود دیکھا ہے کہ تم پہلے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ پھر ڈنڈا لئے ہوئے اٹھے اور اس چبوترے —"

ڈرائنگ تو برا نہیں ۔ مجھے ہو کیا گیا تھا آں وہ بازگشت کہاں گئی وہ درد تھا
کیا ہاتھ پاؤں پہ گھر والے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں کچھ
کچھ پاگل ہوتا جا رہا ہوں ابھی اپنے شہر میں کھو جاتا۔

اس نے وہیں چبوترے کے قریب کھڑے کھڑے جیب سے سگریٹ
نکال کر ہونٹوں میں رکھا اور

ہے نا پاگل پن کہ گھر کا راستہ بھول گیا ان سڑکوں کی بھول بھلیوں میں کھو
گیا

چبوترے پر جھک کر اس سگریٹ کے آخری حصے سے اپنا سگریٹ سلگانے
لگا جو کار میں سے کسی نے پھینکا تھا۔

" اب سجدہ کر رہے ہو بادشاہ ہو۔ " جاتے جاتے ان دونوں
میں سے ایک نے آوازہ کسا۔

وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنا زخمی ہاتھ پیٹا اور اس طرف دیکھا جہاں
ملگجا سا اندھیرا تھا۔ جہاں ابھی چند لمحے پہلے اس کا خیال تھا کہ یہ کنکریاں
اس لئے پڑی ہیں کہ نئی سڑک تعمیر ہوگی۔

رات تو اپنی ہے ہی۔ چلو یہ راستہ دریافت کریں شاید گھر تک

۱۴

میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے سامنے سر جھکائے لوگوں کی قطار میں کھڑا ہوں
سب سے اگلے آدمی کی ناف سے لے کر سب سے پچھلے آدمی کی ناف تک
ایک سرنگ ہے (اس تاریک سرنگ میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔)
میں سرنگ کی دیواروں کو ٹٹولتا، ٹھوکریں کھاتا دفتر کی کھڑکی تک پہنچا ہوں
ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کلرک نے ایک کاغذ تہہ کر کے میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے
"اس کاغذ میں وہ تمام راز ہیں جن کے لئے تمہیں زندہ رہنا چاہیے" اس نے
فقرہ تان کر میرے سر میں مارا ہے۔ میں خوشی خوشی کاغذ کی تہیں کھولتا ہوں
کاغذ بالکل صاف ہے۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔ ابھی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تھی۔ میں نے
کتاب سے نظریں اٹھائی ہیں اور کسی کو اپنے سامنے دروازہ لئے کھڑا دیکھ رہا
ہوں۔ کہتا ہے میرا میٹر بند کر لے گیا ہے تاکہ وہ تمام بلب بجھ جائیں جن کی

کرنوں کے جال میں میں پھنسا ہوں۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر میں بجلی نہیں ہے۔ اگر کسی زمانے میں تھی تو محکمے والے بل کی عدم ادائیگی کے باعث کاٹ کر لے گئے ہیں۔ وہ اپنا غار سا منہ پھاڑے ہنس رہا ہے۔ اس کے لمبے لمبے گزشتہ خوردہ دانتوں سے مجھے کوئی خوف نہیں آیا۔ اس نے ہوا میں پکڑے ہے رنج سے ہوا کو کھٹکھٹایا ہے۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔ میرے سر میں دستک ہوتی ہے۔

وہ کھڑا رہے گا اور میری آنکھیں اطمینان سے کتاب کے الفاظ چنتی رہیں گی۔ کیوں کہ میرا بیڑ خفیہ تہ خانے میں ہے۔

یہ تہ خانہ کہاں ہے ؟

جانے میں اس کوٹھری میں کب سے ہوں، خستہ دیواریں کونوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مکڑی کے جالوں سے بندھی ہیں۔ ہر لحظہ یوں لگتا ہے۔ جیسے جالوں کی گرہیں کھل جائیں گی۔ کوٹھری میں کوئی روشنی نہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں مکڑیوں کی آنکھیں بلب ہیں اور میری آنکھیں روشنی۔ جانے ہم کب سے ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے ہیں! کبھی کبھی یہ سوال درد بن کر میرے سر میں دھڑکنے لگتا ہے۔)

میں گھر سے نکل آیا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں دن نکل آیا ہے۔ روشنی اتنی تیز ہے کہ کائنات سورج کا عکس پڑنے سے سیاہ ہو گئی ہے۔ میرے جوتے پکی گلی کی پکی اینٹوں سے زیر لب سازش کر رہے ہیں۔ میرے پیر اس سازش کا شکار ہو رہے ہیں اور میرے سر کی طرح دکھنے لگے ہیں۔ مگر اندھیرے کے ریشے تانا

ٹکڑوں کے جالے ہیں، لاتعداد پلاٹینم کے تار۔

(پیارے بچو، خوش آمدید!)

انہوں نے مجھے گھر سے نکلتے دیکھ لیا ہے، اور مختلف آوازے کسے ہیں میں مسکرایا ہوں اور میری ساری مسکراہٹ ہوں کر میرے ہونٹوں سے بہہ نکلی ہے۔ آج ان کا نشانہ صحیح لگا ہے۔ ان کی ہنسی نے مجھے دھکا دیا ہے، اینٹوں اور جھونپڑوں کے درمیان اُلٹے ٹیپ ریکارڈر چلنے لگے ہیں۔

(خدا حافظ، پیارے بڈھے۔)

ان میں سے ایک نے بڑی تیزی سے میری طرف دیکھا ہے اور میری نظریں فوراً اپنے ہاتھ کی طرف اٹھ گئی ہیں۔ چھوٹا سا، پیاسا پیاسا۔ نرم نرم اس ہاتھ میں پتھر ہے۔

میں چلتی بس میں چڑھا ہوں جو بس سٹاپ پہ آکے رکی تھی۔ کھڑکیوں میں مکان بجلی کے کھمبے، لوگ، درخت، بھاگے جارہے ہیں۔ میں ساکت ہوں، بالکل ساکت۔ بس کی سیٹوں پر صرف میری نگاہ کے دھبے ناچ رہے ہیں۔

گرڑ گرڑ، بس رکتی نہیں، چلتی جارہی ہے۔ لیکن مجھے اترنا کہاں تھا، اوہ ہاں، اچھا نہیں، اگلے سٹاپ پر سہی۔ اچھا تو پھر اگلا ہی۔

ایک جھٹکے کے ساتھ بس اچانک رک گئی ہے۔ میں نے کنڈکٹر کو تلاش کرنا چاہا ہے تاکہ اسے ٹکٹ کے پیسے دے دوں لیکن بس میں کوئی نہیں۔ مسافر، کنڈکٹر نہ ڈرائیور۔ یہ ڈرائیور کہاں چلا گیا۔ میں نے بس سے اتر کر ڈرائیور کو تلاش کرنا چاہا ہے۔ لیکن بس بیابان کی خاموشی کا محو ہے۔ جانے کون سی جگہ ہے۔ مجھے واپس چلنا چاہیے۔ میں خود بس سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خاموشی۔ انجن میں شاید کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ میں نے اتر کے بونٹ اٹھا

کرانجن میں چھا لکھا ہے، پنکھے کے پٹے میں میرا سر پھنسا ہوا ہے۔

(ماتھے پر لکھا ہے۔ ڈرائیور)

موم بتی روشن ہے، سب سے باہر نیلا حلقہ، پھر نارنجی، پھر پیلا اور درمیان میں سیاہ نکتہ۔ شعلہ منجمد ہے، جانے کہاں سے ایک پروانہ یہ شعلہ چوری کرنے آیا ہے۔ اس نے خاموشی سے غوطہ لگایا ہے، چور کا بیان مثل رومن کر آسمان کو اٹھا ہے، وہ ایک اور آیا۔ ایک اور، ایک اور۔

موم، مثل روم کے ستونوں میں چنی گئی ہے، اور ساتھ ہی یہ منجمد نیلے نارنجی اور پیلے حلقے۔ لیکن سیاہ نکتہ پتھر ہے۔ اور میں اس پتھر کے آئینے میں محفوظ ہوں۔

بہت تیز قسم کی بدبو ہے۔ ایبونیا اور انتڑیوں کے باسی پن کو لائی فضا پر محیط ہیں۔ گودام میں آکر گوشت اور اناج کی زندگی اور موت گڈمڈ ہو گئی ہے۔ پی، کولائی میں زندگی ہے۔ اور یہ زندگی گودام کی موت، فرش پر کاک روچوں کی لاتعداد فوجیں گامزن ہیں۔

یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔

چند کاک روچ اپنی صفیں چھوڑ کر مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ ان کے جسموں سے نکلی آریاں اور خاردار منہ میرے پیروں پہ چل رہے ہیں۔ میرے پیروں کا درد سفر کرتا گھٹنوں تک آگیا ہے۔ یہاں ایک پلاٹینم کے تار بجھ گئے ہیں۔ مجھے ہنسی آرہی ہے کہ آخر یہ کاک روچ چاہتے کیا ہیں۔ یہ بدبو مجھ سے تو نہیں آرہی۔

میں وہ بدبو ہوں جو اس شخص کے اندر جذب ہو رہی ہے جو کاک روچوں پر ہنس رہا ہے ۔۔۔۔ یا وہ شخص ہوں جو کاک روچوں کے پیر چاٹ رہا ہے۔

میرے سینے سے الٹی گڑی لاتعداد میخوں والا فل بوٹ اٹھا لو۔ مجھے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے

خوردبینی خلیوں سے بنے چھوٹے چھوٹے جھنڈے سات رنگوں کا چشمہ میں دھنک پگھل کر سرخ ہوتی ہے اور بہہ نکلی ہے، لہو کے پہلے قدم جمتے جاتے ہیں۔ دوسرے قدم اوپر سے پھسل کر پہلے بن جاتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان قدموں میں میرے قدم بھی ہیں، میں اس دریا پر پکنک منانے آیا تھا) دریا میرے گرد ایک بہت بڑی قوس میں گھوم کے دائرہ بن گیا ہے۔ میں اس سرخ سانپوں کی کنڈلی میں قید ہو گیا ہوں۔ کنڈلی کے وسط میں بیٹھا خوردبین سے رومال کے خلیوں میں فرار کی راہ ڈھونڈھ رہا ہوں، خوردبین کی آنکھ سے لاتعداد آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

ہر آنکھ میری آنکھ ہے، میں کس راہ سے نکلوں ۔؟

دیکھو میں کونے کے سرے کا چنا ہوا اور قیمتی پتھر رکھتا ہوں، جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یا ٹھیس لگنے کا پتھر ٹھوکر کھانے کی چٹان ہوا۔ کیوں کہ وہ نافرمان ہوئے۔)

پتھروں پر میرا نام کندہ ہے اور میں نے ہی پتھروں کے تخت پر بیٹھے شخص کے ہاتھ میں وہ کتاب دیکھی جو کہ اندر سے اور باہر سے لکھی ہوئی تھی اور جسے مہریں

لگا کر بند کیا گیا تھا۔

کون ان مہروں کو توڑنے کے لائق ہے ——یہی نہیں ——
کون ان مہروں کو توڑنے کے لائق ہے ——میں ہوں۔ ——
میرے سر میں مہرے توڑنے کی آوازوں سے کنکھجورے رینگ رہے ہیں:-

سیاہی مائل سبز رنگ پیروں کے راستے تاناگوں میں سفر کرتا ہوا میری گردن تک آپہنچا ہے۔ پلاٹینم کے تار بجھ گئے ہیں اسرار پیروں کے درمیان لکڑی کے جالوں میں لفظ صدوب ہے۔ اس کی بوندیں خاردار تاروں سے ٹپکتی ٹپکتی اٹک گئی ہیں، لاتعداد چیونٹیاں بوندوں کا رس چوس کر لوٹتی ہیں پیاسی چیونٹیوں کے کانوں میں سرگوشی کرتی ہیں اور کھلکھلاتی آگے بڑھ جاتی ہیں (ان کی کھلکھلاہٹ سے میرے گوشت کی دیوار پر گدگدی ہوتی ہے)۔
میرے جسم کے تین چوتھائی حصے میں جو کہ پانی ہے۔ بلبلے پھوٹ کر ہنس رہے ہیں۔ ان کے متعفن بھبکوں سے میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے متلی ہو رہی ہے۔ ایک ایک ریشہ ٹوٹ رہا ہے۔ ڈھیلا ہو رہا ہے اس لفظ کے آخری سانس کیا ختم نہیں ہونے۔ ایک لمحہ بس ایک لمحہ۔

یہ لمحہ پھیل کر ابدی ہو گیا ہے۔
مجھے لطف آنے لگا ہے۔

"یہ نالی میں اوندھا پڑا تھا۔"

(یہ غلط کہتا ہے میں تازہ پھلوں کے تخت پر بیٹھا تھا)

"یہ لاوارث ہے، ہم اسے آپ کے پاس لے آئے ہیں"

(ہا ہا ہا ہا ہا) جاہل۔

اس پر چھینکے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے اس کے لعاب وار گوشت نمونہ خوردبین سے دیکھا ہے جو تصدیق کرتا ہے کہ اس کو پیروں سے لے گردن تک زہر باد ہو گیا ہے۔ اس کے سر کو بچانے کے لئے اسے جسم سے علیحدہ کرنا ضروری ہے۔

"لیکن ڈاکٹر مجھے کوئی تکلیف نہیں"

"نہیں تمہیں تکلیف ہے"

"نہیں"

"بیوقوف۔ مجھے تم سے زیادہ علم ہے۔ سر کو بچانا پڑے گا۔"

"قتل ہونے میں بڑی لذت ہے۔"

چوراہا
افسانے
انور سجاد

گائے

ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔

"اب اس کا دھیلا نہیں ملنا" ان میں سے ایک نے کہا تھا، "ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔"

لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔

"تم چپ رہو جی بڑے آئے عقل والے۔"

ننکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں جب زبان پہ لاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں جس روز سے میں نے اپنی کو پہچانا ہے، اسی روز سے کچہری کو بھی جانا ہے، اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے

لے جانے کی سوچ رہے ہیں، اس دن سے میں ہر لمحہ غلیم ہوتا ہوں، یتیم ہوتا ہوں، میں کیا کروں، یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں۔ کیوں کرتا ہوں۔

آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے۔ نکتے سے رہا نہیں جاتا تھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ بیکار برباد کیا جائے، میں ناسمجھ ہوں ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔"

"آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔"

"بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔"

میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں۔

پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی، لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ نکا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاباش میری چتکبری، میری گائے۔ میری گئو ماتا، ہلنا نہیں۔ تم نہیں جانتیں، یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں، جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ، ورنہ ــــــ نہیں تو ــــــ

گائے اپنی جگہ پر اڑی، مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا

ہڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ بگلے کے کان بھی بند ہو رہے تھے ــــ رفتہ رفتہ ـــــ

سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا۔ کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھمبا ہو جائے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے۔

اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا۔

ٹرک کی آواز پر بگلے نے مڑ کے دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور پھر کھرلی میں منہ ڈال دیا تھا۔ جہاں نکا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔

"آپ لوگ اسے واقعی ـــ اسے یقین نہیں آتا تھا۔

"نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا۔ ؟"ـــ ایک نے کہا تھا۔

"بابا، یہ بگلا مجھے دے دو۔ میں اسے۔

"حکیم کی اولاد"ـــ دوسرے نے کہا تھا۔

"بابا اس کے بغیر میں ـــ"

"مجنوں کا بچہ۔"ـــ تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا پانچواں سارے بزرگ، سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے۔ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ بیٹھے:۔ ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے

او۔ کمبخت سوداگر، مجھ سے ۱روپے، مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے۔ جب، جب میں بڑا ہو جاؤں گا ــــــ

ہا ہا ہا ہا ــــــ

جب، جب میں کمانے لگوں گا ــــــ

ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔

تب تب تک تو چکبری کی ہڈیوں کا سُرمہ بن گیا ہو گا۔ ہیں یہ میں کیا کروں ان میں سے ایک، گائے کو لانے کے لئے کھرلی کی طرف گیا تھا۔ ننگا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا۔ یونہی دیکھنے کے لئے۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھرلی میں منہ مار کے دانتوں میں پیٹھے دبائے تھے مڑ کے بچے کو دیکھا تھا اور جانے کے لئے کھُر اٹھایا تھا۔

" نہ ۔ نہ ۔ نہ" ننگا چیخا تھا۔

" بکو مت "

گائے کھڑی ہو گئی تھی۔

" ہے۔ ہے۔ ہے " بڑے نے زور لگایا تھا۔

" نہ چتکبریے۔ نہ ــــ نہ گئو ماتا ــــ نہ "

" چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان "

بچے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔ "چلو بیگم صاحب! اڑیل کہیں کی۔ تمہارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے "

گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان، قید میں پھڑ پھڑا کے رہ

گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں دہیں کی دہیں تھی۔ ننکا مسکرایا۔ پھر فوراً ہی اداس ہو گیا تھا۔

یہ تو یہ تو بک بھی چکی ہے۔ اسے جانا ہی ہوگا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے، تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں، کاش میں حکیم ہی ہوتا۔ اس بچھڑے کو شرم نہیں آتی، ماں کے جسم پہ نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا اتو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گائے کی دم پکڑ کر اسے تین چار بل دیئے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دوڑ بھاگی تھی۔ اس نے ننکے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ ننکے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

دو فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت ـــــ

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لئے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھر رکھا۔

"ر چڑھنا۔"

"اس کی زبان کاٹ لو ـــــ یہ گائے کو ورغلاتا ہے" ڈراتا ہے۔

ننکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے پہلے تختے کو دیکھا۔ پھر ننکے کی طرف۔

ورنہ تیرے منہ پہ —— لعنت —— اک لعنت ——

نکے کا سر شرم سے جھک گیا تھا ——

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چنکبری جانتی ہے جانتی ہے کہ وہ نکے پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں، کیوں، وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔ ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں، گائے کی ٹانگیں تھر کی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جما کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر نکے کی طرف منہ کر کے سیدھی ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔ —" آؤ، بیٹو"، اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا۔

نکا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق بے حس۔

"یوں بات نہیں بنے گی"۔— ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

"تو پھر ؟"

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی۔ پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی نکے کے

قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔
نکّا — جسم کا مفلوج حصّہ۔
دیکھو، دیکھو، وہ تو بائیں طرف —" ایک چونکا تھا۔
" قدرتی بات ہے" بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔
گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکار سی مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔
اس بچھڑے کو یہاں لے آئے — یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہیئے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔"
نکّا — مفلوج وجود —
ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی تھی نکے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی، قدم اٹھاتی، رکتی چلتی بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ سے نکّے کی زبان سے گالی پھسلی تھی بچھڑا، تختے پر چڑھ کے ہچوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جا کے پھر رُکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے نکّے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے بھٹوں کا گچھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لئے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے۔ اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا پھر دوسرا کھر۔

خدا معلوم ننکے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے تھے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دونالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنون میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پہ بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرد تے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لئے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا — ننکے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو، بچھڑے کو ڈرائیور کو، بابا کو یا اپنے آپ کو —— یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جا کے دیکھے اور آ کے مجھے بھی بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔

اس نے گدھے کی پیٹھ سے بالٹیاں اٹھا کر پوری قوت سے پانی پھینکا۔

"یہ بھی لو۔ یہ بھی لو۔"

سفید دھول کا غبار اٹھا اور پانی پر جم گیا۔ اس نے اپنے جسم پر آیا ہوا سا سا پسینہ دونوں ہاتھوں سے نچوڑ کر زمین پر ٹپکایا اور گدھے کو ہنکاتا کیکر کے درخت کے نیچے آگیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

زمین کی زبان پر پھر کانٹے اگ آئے ہیں۔ سارا پانی بھاپ بن کر آسمان پر چلا گیا ہے۔ ابھی بادل آئیں گے۔ کب بادل آئیں گے کہ چاول بوؤں۔

گدھا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ جانے اسے کیا سوجھی کہ ہاتھ اور گھٹنے ٹیک کر وہ بھی زبان نکال کر ہانپنے لگا۔ "میں تم ہوں اور تم میں ہوں"

اس نے گدھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی کی۔ گدھے نے زبان منہ میں ڈال کر بڑی سنجیدگی سے منہ موڑ لیا۔ وہ جھینپ گیا۔ خفت کو مٹانے کے لئے ہنسنے لگا۔ دھیمی دھیمی ہنسی رفتہ رفتہ دیوانہ وار قہقہوں میں ڈھل گئی۔ وہ اٹھا۔

ہا ہا۔
کوئی جواب نہیں

ہا ہا ہا ہا۔
مشرق مغرب، شمال جنوب ہا ہا ہا ہا کوئی نہیں۔ یہاں جو میری ہنسی سن کر انگلی اٹھائے۔ دہ وہ گھر دہ گھر دہ اوہ کی سائیں سائیں دور دور صرف ببکر کے درخت ہیں جو میری آواز سن کر جھومتے ہیں اور دھوپ زدہ آسمان پر انگلی اٹھاتے ہیں۔
شکریہ۔

اس کی آنکھیں کیکروں کی سبزی چوس کے پھر گدھے پر آگئیں۔ وہ اس سے اسی طرح منہ موڑے کھڑا تھا۔ اسے گدھے پر غصہ آگیا۔ اس نے اس کے پیٹ پر دو چار مکے رسید کئے۔ اور اس سے ردعمل کی امید میں اسے دیکھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔
گدھا !!! ہا ہا ہا۔
گدھے نے منہ اٹھا کر آنکھیں جھپکیں۔ اس کو دھوپ میں کھڑے دیکھ کر بلغت اسے بڑا ترس آیا۔ اور اسے رسی سے کھینچتا، انجیر کے سائے تک لگا

کر بیٹھ گیا۔

درخت کے نیچے بھی دھوپ اس کی چھاؤں کہاں گئی ہوں ں ں ں اس پر کتنے پتے باقی رہ گئے ہیں —— سورج —— انجیر کی خشک باشیں —— کاٹ رہی تھیں۔

ایک پتہ نہیں کہاں ہے، ایک دو تین چار۔ ارے یہ درخت تو۔ اس کی آنکھوں میں تیز روشنی کے اندھیرے چھا گئے۔

ہرا بھرا ہے۔ ابھی تو کافی پتے ہیں۔ اتنے کہ درخت کے نیچے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں ملیں، کھولیں، ناچتے ہوئے تارے افق پر جا کر ٹوٹ بھے۔ چمکتی لکیر چھوڑ گئے۔

ہھوں دریا آآآآ۔ مکی جوار، باجرہ۔ میں چاول کیسے بوؤں کہ سونا کا ٹوں دریا آآآ۔

اس نے آہ کو فوراً گلے میں دبا دیا۔

میں آہ کو حلق سے نکلنے نہیں دوں گا۔ کہیں وہ لوگ سُن نہ لیں۔ میں ہارا نہیں کیونکہ کے درخت سبز ہیں، ان کی جڑیں دور دور زمین کی کوکھ تک اتر گئی ہیں کہ یہ سر سبز ہیں۔ میں بھی وہاں ہوں۔ ایک دن ہماری جڑیں زمین کی چھاتیوں سے دودھ کھینچیں گی۔ لیکن کب کب ان لوگوں کو یہاں سے بھاگے صدیاں بیت گئی ہیں اور میرا جسم شل ہو گیا ہے۔ میں آہ نہیں بھروں گا۔ کہیں وہ سن نہ لیں، وہ بڑھا نہ سن سکے۔ جس نے کہا تھا کہ میں معتوب ہوں

مجرم ہوں اور یہ میری سزا ہے کہ ساری عمر اس قید میں رہوں ۔ میں آہ نہیں بھروں گا کہ یہ راستہ میں نے آپ پسند کیا ہے ۔ دریا سے یہاں تک یہاں سے دریا تک ، یہ اسیری میں نے خود چنی ہے اور میں بہت خوش ہوں یہ آہ نہیں نکلنی چاہیئے ۔

اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کے پھر آنکھوں سے سامنے دیکھا ۔ گرم ہوا گھنڈروں کے کھلے دروازوں کو کھٹکھٹاتی تھی ، منڈیروں سے گرم خاک اڑاتی تھی ۔

اب وہ بڑھا کمبخت کیا سنے گا ۔ اب وہ تمام سیاہ بخت کیا سنیں گے جنہوں نے اس فضا پر اپنے کان بند کر دیئے ، فرار ہو گئے ۔ سارے ویرانوں میں بھٹکتے ہوں گے ۔ ہریالی ہو گی کہ پرانے پیروں کو ڈستی ہو گی کہ وہ اپنی خاک کو ر دملہ کر آتے ہیں ۔ صرف میں ہوں ، کیکر کے درخت یا تم میں ہوں ۔

" سنتے ہو میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں ہوں ۔ "

اس نے گدھے سے کہا ۔ گدھے نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دانت نکالے ۔ ڈھینچوں کا ارادہ کیا ، پھر ملتوی کر کے ہوا میں منہ مارنے لگا ۔

" کہ نہیں ہوں ؟ "

اس نے گدھے کی چپ سے خفا ہو کر پلٹ کر خالی گھنڈروں کو دیکھا ، پوچھا ، سپید مٹی سے بگولے جنم لیتے تھے ۔ اڑتے ہوئے آتے

تھے اور ان گھروندوں کی دہلیزوں پر دم توڑ دیتے تھے۔ یکلخت گدھے
نے منہ اٹھا کر ایک لمبی ڈھینچوں کی۔

"چپ کرو گدھے۔ میں نے سوال کیا ہے"۔ میں نے کس سے پوچھا
ہے۔

اس کی نظریں گدھے کی چیخ پر سوار ہو کر آسمان تک پہنچ گئیں۔ چلچلاتی دھوپ نیلاہٹوں کو
سلگتی تھی اور زمین پر سفیدی اگلتی تھی۔ میں ہوں کہ میری آنکھوں میں کائنات کا
کوئی رنگ نہیں۔ نہ زمین آسمان ہے۔ آسمان زمین، رنگ کی غیر موجودگی
سفیدی ہے۔ سیاہی ہے اور سیاہی زمین پر سفید داغ ہے۔
سفید مٹی میں اگی خاردار جھاڑیوں سے گرم ہوا الجھتی تھی اور نہ
بگولا بن کر آسمان کو اٹھتی تھی۔

میں ہوں کہ زمین اور آسمان کے درمیان ستون ہوں، نہیں ہوں کہ چلتا
ہوا خالی گھروندوں کے دہلیزوں پر دم توڑتا ہوں کہ پھر جنم لیتا ہوں۔ اور
آسمان کو اٹھاتا ہوں کتنا خوبصورت چکر ہے سب بکواس ہے۔ میرا اس
سے کوئی تعلق نہیں، میری آنکھوں میں تو کیکر کے درختوں کی سبزی ہے۔
اور میں اس لئے ہوں کہ زمین کو چاٹتے سفید پھولوں کو دیکھتا ہوں اور ان
سے جنگ کرتا ہوں۔ میرے جسم پر زبانوں کے زخم ہیں۔

"بابا یہ کہیں۔"

اس نے اچانک گدھے سے کچھ کہنا چاہا۔ گدھا اسی طرح منہ موڑے
کھڑا تھا۔ اس نے گدھے سے مایوس ہو کر اپنے مکان کی طرف دیکھا۔ دہلیز

دیوانس کے سامنے کچھ رقبے ہیں سبزیاں اگی تھیں اور اس سرسبز رقبے کے وسط
میں اس کے باپ اور ماں کی قبریں تھیں اس کے زندہ رہنے کی وجوہ۔
"ابا یہ کہیں تمہارے وجود کا عرق تو نہیں، سفید سفید جو گہرائی سے سطح پر
آیا ہے، "ماں یہ کہیں تیری چھاتیوں کا دودھ تو نہیں جو صدیوں مٹی تلے سے ابل
کے دھرتی کے سینے پر پھول بنا ہے۔
"یہ دھرتی سوتیلی ماں ہے۔ ہمارے لئے اس کی چھاتیوں میں دودھ
نہیں۔" سب نے زمین پر سفید سفید داغوں کا سیلاب آتے دیکھ کر کہا تھا۔
"نہیں۔ نہیں۔" اس نے انہیں یقین دلایا تھا۔
"اس کی چھاتیوں کو کوڑھ ہو گیا ہے۔"
"تمہاری ماں چھوٹی ماں ہے۔"
"ہم نے تمہارے کہنے پر اتنے دکھ سہے ہیں۔"
"اب ہم یہاں زندہ نہیں رہ سکتے
"ہم اس پر تھوکتے ہیں"
"تم ماں کے جنے نہیں۔"
وہ ان کے پیروں میں تھوک کر غصے میں کانپتا اپنی کوٹھڑی میں آیا تھا
اور کھڑکی سے ٹھنڈے سے رقبے میں کھڑی فصل میں اپنے ماں باپ کی
قبروں کو دیکھنے لگا تھا۔
کیوں ماں کہیں یہ تیری چھاتیوں کا۔
اس کی نظریں قبروں سے پھسل کر سفید ہی پڑتی افق پہ جا پہنچیں۔

دریا ـــ آ ـــ

اسے دریا کے پانی سے نہلائیں " اس نے سوچا تھا۔ " یہ کوڑھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بارش کا انتظار کرو۔ رحمت کا انتظار کرو۔"

اس کی نظریں دریا کی لکیر سے اٹھیں۔ آسمان قوس بنا کر حدِ نگاہ پر محیط ہو گیا۔

آسمان یہ آسمان یہ آسمان الٹا لٹکا کنواں ہے۔ جب کبھی کبھی ہنستا ہے تو اس کی تھوکوں کی چھینٹوں میں، مکئی کی جوار باجرہ یا جرہ۔ چاول کیسے بو دوں کر سونا اتاروں۔

" چاول کیسے بوئیں کر سونا اتاریں۔ ہم سب مقروض ہیں مجھے استاد بنا ہے، استاد دینا ہے۔ " ایک ایک کر کے سب نے کہا تھا " پانی کا ایک قطرہ نہیں اور چند روز میں زمین کی سفیدی ہمارا کفن ہو گی۔ "

" سنو سب میری بات سنو "

" ہاں بھئی ماں کے جنے کہو۔ "

" دریا اونچائی سے اترتا ہے۔ چلو نالی لگا کر پانی یہاں لے آتے ہیں۔"

وہ سارے ہنستے تھے [illegible] الی ـــ احمق یہ کوڑھ اندر سے آیا ہے ـــ پاگل ای اوئے [illegible] ای اوئے۔ "

" اس کے پانی میں شعلہ ہے۔ "

پاگل ای اوئے، پاگل ای اوئے۔ ہنستے ہنستے ماں کی کیہ کھ کو ٹھوکر مار کے پہلے ایک گیا تھا۔ پھر دوسرا۔

"غدار بھگوڑو ۔۔۔ تم ذرا سی بات پر قطع تعلق کرنے پر تلے ہو۔"
اس نے گدھے کو ہل میں جوتنا تھا اور پاگلوں کی طرح زمین پر لکیریں کھودنے لگا تھا۔

"سنو۔ میری بات سنو!"

"ہاں بھئی ماں کے جنے۔ اب کیا کہتے ہو۔"

"یوں کرتے ہیں کہ یہاں انجن لگا کر اس بس کو نکال پھینکیں۔"

"پاگل ہی او سئے۔ ہمارا بال بال گروی پڑا ہے۔ ہم خود بک گئے ہیں۔ اتنی رقم سے کہاں سے لائیں۔

"بھتہ، انجن لگائیں گے ماں کے یار"

"میں شہر جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے۔"

وہ سارے ہنستے تھے ۔۔۔ "اگر ہماری آواز ان کانوں تک پہنچ سکتی تو ہم پہ داغ ابھرنے ہی نہ دیتے۔"

پاگل ہی او سئے۔ ہنستے ہنستے ماں کی کوکھ پر ایک اور گیا تھا۔ پھر ایک اور، باقیوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے تھے۔ اس نے ساتھ والے گھر میں پناہ ڈھونڈنا چاہی تھی۔ وہاں بھی لٹکتا ہوا لونگ ماند پڑ گیا تھا اور لونگ والی سر جھکا کے باہر صحن میں بکری کے بچے کو سینے سے لگا کر پھسک پھسک کر رونے لگی تھی۔

اب ہم بھی چلے جائیں گے ۔۔۔ اس نے بکری کے بچے کی پیٹھ سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

ہمارے مویشی مر رہے ہیں۔ ہمیں بچے پالنا ہیں۔ بیٹیوں کا بیاہ کرنا ہے۔ اس زمین پر بانجھ کا سایہ ہے۔ اور اس زمین کا سایہ ہماری چھاتیوں پر ایڑیاں مارتے مارتے ہماری ایڑیاں چھل گئی ہیں۔ چشمے کہاں ہیں۔

چشمے کہاں ہیں کہ سفیدی سبز ہو، سبزی سرخ ہو، کنواریوں کے گالوں میں لالی اترے۔ لونگ والی اپنے لونگ پر گھونگھٹ کاڑھے، جو کہ اس کی ماں کی ماں نے، پھر اس کی ماں کی ماں نے جو کہ پہلی ناک سے اس کی ناک تک پہنچا ہے۔

"شہر سے کب آئیں گے وہ لوگ۔"

اس کے شہر سے لوٹنے پر لڑکی ہر روز اس سے پوچھتی تھی۔

"کب آئیں گے وہ؟ پھر وہ آخری مرتبہ اس سے پوچھنے آئی تھی۔ اس کے بابا نے کہا تھا کہ آئندہ اگر وہ اس خود سر ضدی اور بے ادب سے ملے گی تو وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہیں پھینک جائے گا۔

"وہ ایک دن میں۔"

بڈھے نے کہا تھا اس نے ان سب کو فریب میں رکھا ہے۔ سبز باغ دکھاتے ہیں۔ دن کو سپنے دیکھنے والا مجرم ہے ـــــــ گردن زدنی ہے۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے۔

مجرم سے راہ و رسم رکھنے والا بھی مجرم ہے اگر تم اس سے پھر ملیں تو تمہاری لاش اس سفید آگ میں جلتی رہے گی۔

"ہاں مجھے یقین ہے۔"

اور یہ کوئی گدھا بھی نہیں ہو گا جو تمہیں اس اذیت سے نجات دلا دے۔

"اگر تمہیں یقین ہے تو پھر مجھے بھی یقین ہے۔"

لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور دبے پاؤں چلتی اپنے گھر کی کھڑکی میں غائب ہو گئی تھی۔

اس نے کھڑکی سے نظر یں پھیرا کر کنکھیوں سے گدھے کو دیکھا۔ گدھے نے دانت نکال دیئے۔ وہ اس کی استہزائیہ مسکراہٹ دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا۔

"میں اس کے بارے میں تو سوچ نہیں رہا تھا۔ بخدا میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ میں نے اتنا عرصہ کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ اچھا نہیں تو نہ مانو۔"

اس کی نگاہیں پھر سامنے کو اٹھ گئیں۔ بگولے دہلیز کو پار کر کے کال کوٹھریوں میں جاتے تھے اور اندھیروں سے گلے ملتے۔

ایک دن وہ آئے تھے اور اس نے سوچا تھا کہ اب میری گردن بگولوں اور اندھیروں کی گرفت سے آزاد ہو گی۔ نیچے پچھلے باسیوں نے دیکھا تھا۔ دونوں بابو انگریزی میں باتیں کرتے ہنستے ہوئے اس کے گھر سے نکلے تھے اور پیٹ میں سوکھے شلغموں کی گڑگڑ کو دبا کر اس کے گدھے پر سوار ہو گئے تھے۔ علاقے کے دورے سے لوٹ کر انہوں نے اپنی خالی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر منہ ٹیڑھا کر کے کہا تھا۔ "سوری، یہاں پیسہ اور وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

انہیں جاتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا جسم

سنسنا اٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ان بابوؤں کو سفید زمین گاڑ کر سہاگہ پھیر دے۔ لیکن انہیں وہ صرف دیکھتا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے کانوں میں دھک کی جگہ قہقہے ابھرنے لگے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا لوگ چیخ چیخ کر ہنس رہے تھے۔

پاگل ای اوئے۔ پاگل ای اوئے۔

قہقہے بڑھتے بڑھتے پھیل گئے۔ کھڑکی کھٹاک سے بند ہوئی۔ دور نیا بالوں سے بگولوں کا قافلہ آرہا تھا۔ لوگوں کی ہنسی اور تیز اور تیز۔

پاگل ای اوے، پاگل ای اوئے۔ انہوں نے نیچے پیچھے مویشیوں پہ سامان لادا تھا۔ ہنستے ہنستے سب نے کو کھوپر لات ماری تھی۔ اور قدم بڑھا دیئے تھے۔

انجیر کے تنے سے ٹیک لگا رو ہانسا کھڑا وہ خاموشی سے اپنے ہاتھ میں انجیر کے پتے کو سہلاتا رہا تھا۔ سب سے آخر میں وہ اپنے بابا کے ساتھ نکلی تھی۔ اس نے ہوا کا گھونٹ بھرا تھا۔ دونوں باپ بیٹی نے کچھ عرصہ ایک دوسرے سے کھسر پھسر کی تھی اور اس کے پاس آئے تھے۔

"اپنی ہٹ دھرمی چھوڑ دو اور چلو"

لونگ والی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ چپ تھا

"میرے تمہارے باپ کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔"

"میرے اپنی ماں کے ساتھ زیادہ گہرے تعلقات ہیں۔"

"یہ تھوڑا سا رقبہ تمہارا کب تک ساتھ دے گا۔"

اس نے کیاریوں کی طرف دیکھا تھا۔ جب تک میں ہوں۔

"چلو ہم دریا کے پار چلیں"

دریا کے پار بھول کا رستہ ہے۔ جو گئے۔ کھو گئے۔

"میں نے تمہارے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اپنی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کروں گا۔"

لڑکی نے پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اژدھے کی آنکھیں تھیں۔

اس کے ہاتھ میں انجیر کا پتا بری طرح مسلا گیا تھا۔

"چلو۔"

میرا دوسرا قدم خلا میں پڑے گا۔

"بولو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

اس نے اپنے آپ کو اژدھے کی آنکھوں سے چھڑا لیا تھا۔ لڑکی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

بڈھے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "تم اس ویرانے میں زندہ نہیں رہ سکو گے۔ وہ دیکھتے ہو سامنے۔"

ٹنڈ منڈ درختوں پر گدھ سر نیوڑھائے بیٹھے تھے۔

"میں نے اپنے لئے یہ فیصلہ خود کیا ہے۔ کیوں کہ مجھ میں زندہ رہنے

کی خواہش ہے۔ تم لوگوں میں سکت نہیں ــــ اس لئے بھاگ رہے ہو وہ دیکھتے ہو سامنے کیکر کے درخت کیسے ہرے بھرے ہیں جو ہر روز ایک سوت بڑھتے ہیں ۔"

بڈھے نے احمقوں کی طرح کیکروں کو دیکھا۔

"ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ اتھاہ سے رس پیتی ہیں ۔

تم نے فرار کا راستہ خود چنا ہے۔ تم اس جگہ کو ترک کر کے کہیں جگہ نہیں پاؤ گے۔ بھٹکتے رہو گے کہ تمہاری یہی سزا ہے ۔"

"بکواس بند کرو" بڈھا چیخا تھا۔ اور ٹنڈ منڈ درختوں پر گدھوں نے سر اٹھا کے دیکھا تھا۔

"ہم تمہیں ترک کرتے ہیں کہ تمہارے نصیبوں میں یہی لکھا ہے ۔

"جو بھی کہو ـــ یہ میری اپنی خواہش ہے ۔"

"تمہاری وابستگی کی یہی سزا ہے ۔" اس نے اپنی لڑکی کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ "یہ سیاہ بخت ہے"

لڑکی نے اپنی بھیگتی لونگ پر سفید چادر کا پلو گرایا تھا اور چلی گئی تھی اور رینگتی لکیر کی آخری کڑی بن گئی تھی۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر سارے گدھوں نے اپنے پر پھڑپھڑائے تھے اور لکیر کے ساتھ ساتھ ہو لئے تھے۔

"میں سیاہ بخت ہوں" ــــ رینگتی لکیر کو فاصلہ نگل گیا تھا۔ وہ مسکرایا تھا اس لئے کیکر کے پتوں کی ساری سبزی آنکھوں میں سمٹی تھی اور زمین پر لوٹنے لگا تھا۔ جب اس کے ایک ایک مسام میں سفیدی کھد گئی تو اس نے عزم کے

ساتھ گدھے پر بالٹیاں لادی تھیں۔ اور اس کی خوشنودی کو چوما تھا۔ ہم سیاہ بخت ہیں میری جان کہ ہم نے یہ راستہ خود چنا ہے۔" اور اسے بڑی محبت سے ہانکتا دریا کو روانہ ہوا تھا۔

اس نے کھڑکی میں اندھیرے اور بگولوں سے آنکھیں چھڑا کر زمین کو دیکھا۔

ہوں پھر زبان خشک ہے۔

اس نے اٹھتے ہوئے گدھے کو ہانکا۔

آؤ پھر دریا کو چلیں کہ پانی بھاپ بن کے آسمان پر چلا گیا ہے، آؤ کہ ہم اس دائمی عمل کا حصہ ہیں یہی ہمارا انعام ہے، یہی ہماری سزا ہے کہ یہ ہمارا اپنا فیصلہ ہے کہ ہم زندہ رہیں گے۔ ہماری کش مکش کا ثمر ہماری خواہشوں کا تسلسل ہے۔

اس نے گدھے پر بالٹیاں لادیں اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا دریا کو چل دیا۔

اختتامیہ

اردو افسانہ کے قارئین کے لئے 'چوراہے' کی کہانیاں غیر معمولی حد تک تجرباتی اور انوکھی ہیں۔ جب یہ کہانیاں مختلف جرائد میں شائع ہوئیں اور ادبی محافل میں پڑھی گئیں تو قارئین اور سامعین نے انہیں جدید شاعری کی بہن کہا اور جب سادہ لوحی سامنے آئی میں قصور اس افسانہ نویس کا نہیں بلکہ افسانوی ادب کے گندم نما جو فروش نقادوں کا ہے، جنہوں نے مقبولیت کی کسوٹی بنا کر قارئین کے ساتھ دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ منٹو کی وفات کے بعد اردو افسانے کی سست روی، جذباتی اور اکتا دینے والی تکرار سے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ آجکل کا افسانہ غزل بن گیا ہے۔ افسانہ نویسوں کے پاس محبت اور جنس کے قصوں کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا۔ زندگی کے بطن میں جو تغیرات جنم لے رہے ہیں۔ بین الاقوامی انسان کی شبیہ جو رنگ بدل رہی ہے۔ ان سے اردو کے افسانہ نویس اور نقاد دونوں بے خبر ہیں یا تشخیص کی صلاحیت نہیں رکھتے کیوں کہ علم سے دونوں کو چڑ ہے۔ اور آگہی ان کے لئے گالی ہے۔ ان کے نزدیک کہانی کچے جذبات کا اظہار اور یادِ رفتگاں کو قلمبند کرنے کا حسین بہانہ ہے۔

لیکن یہ حسین بہانوں کا دور نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے مرحلۂ فکر ہے کیونکہ انسان کا مقدر ایک نئے چوراہے پر ہے جہاں وہ ظاہر و باطن کے الجھتے ہوئے گھتم گتھا راستوں اور مختلف نظام ہائے زندگی میں گھرا ہوا ہے۔ وہ اس چوراہے پر کس طرح آیا۔ اس کی شہادتیں 'چوراہے' کے مختلف

افسانے ہیں جو جدید انسان کے ذہنی اور جذباتی روئیداد سے مرتب ہوتے ہیں۔ 'پچھڑا ہے' کے افسانوں کا انسان (EXISTENTIAL SITUATION) میں ہے جس نے زندگی کو تیاگنے کی بجائے قبول کیا ہے۔ یہ قبولیت ہی اس کی آگاہی اور اس کے کرب کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اس کے تمام عوامل کی غایت وجود کی معنویت کی تلاش ہے۔ اس نے اس سفر میں مروجہ مابعد الطبیعاتی نظام کو قبول کرنے کی بجائے زمین اور اس میں اگنے والے نظاموں کو اپنا حوالہ بنانے کی کوشش کی ہے اسے اپنی جبلی آزادی کا احساس ہے لیکن وہ انا کا قیدی ہے۔ وہ کرنے اور نہ کرنے کے تضاد میں تلملا رہا ہے۔ اس کی بے بسی میں انسانی زندگی لایعنیت کا ایک کھیل نظر آتی ہے۔ کبھی وہ لایعنیت کو معنویت سمجھتا ہے۔ کبھی وہ عہدِ حاضر کا بدھ بن کر نروان کی تلاش میں نکلتا ہے، لیکن رنجیدہ اور ناخوش واپس آتا ہے۔ کبھی صدا بصحرا بن کر پاگلوں کی وادی میں گھومتا ہے۔ اس کی جستجو کا منتہا کیا ہے؟ اس کا جواب پھر جستجو ہے کہ قاری خود ایک لفظ بن کر 'پچھڑا ہے' کے جملوں کا جزو بن جائے اور بذات خود مصنف کے ساتھ اس سفر کو طے کرے۔ وہ مختلف سطحوں پر مختلف جواب دینے کی کوشش کرے گا۔ 'پچھڑا ہے' کے افسانوں کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ مصنف نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ عہد حاضر کے مختلف تضادات کو محسوس کیا ہے۔ اس نے اپنے معاصر تمام نہاد فہم کے جدید افسانہ نویسوں کی ذہنی ذہنیت، لکھنو کے مٹتے کلچر کے ماتم اور جنسی کشتیوں کو موضوع نہیں بنایا بلکہ انسانی تماشے

میں انسان کو مرکز بنا کر اس کی بے چینی اور گھبرائی ہوئی صورت کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ان کہانیوں کا کوئی مخصوص جغرافیہ نہیں۔ ان کا تعلق ایک آفاقی سیاق و سباق سے ہے جس میں انسان اجتماعی صورت میں ہیں جس میں حاکم اور محکوم ہیں جس میں مشین اور پرزوں کی کھڑکھڑاہٹ، ہسپتالوں کے مریض، رُک رُک کے چلتے ہوئے دلوں کی دھڑکن، ذات کی گھٹن ہے۔ "چوراہے" کے مطالعے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے عوامل ایک دوسرے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ مختلف نظاموں میں آزمائش کے چوراہے پر ہیں۔ کیوں کہ اس کے سامنے رستے گم ہو گئے ہیں۔ وہ شب و روز سے نبرد آزما ہے۔ اس کے کردار دن کی دوڑ وقت کے ساتھ ہے، جو خواہشوں، نفرتیں، حقارتیں اور زنجیر کے علامیے ہیں اجنبیں انسانی تاریخ یاد ہے جو سانپ، انجیر کے درخت، عیسیٰ چانکیہ، ریلکے کے تجربات سے آگاہ ہیں۔

"چوراہے" کی موضوعات کی طرح ان کی تکنیک بڑی متنوع ہے (تکنیک سے مراد محض اسلوب بیان ہی نہیں بلکہ سوچ ادراک اور اظہار کے تمام مراحل ہیں) مصنف کا طریق کار SURRLEALISTIC ہے۔ وہ انسانوں، اشیاء اور مناظر کی منطقیت کو اپنے جذباتی تجربے کے زیر اثر نئے طریقے سے مرتب کرتا ہے اور اس کے پس منظر کو ان سے غیر منقطع کر دیتا ہے۔ وہ استعاروں میں سوچتا ہے اور استعاروں اور حوالوں کے ذریعے اظہار کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کہانیوں میں تجرید کا عنصر کافی نمایاں ہے۔ اس لئے عام

قاری کے لئے بعض اوقات افہام میں دقت پیش آتی ہے۔ ''پچوراہے'' کے افسانوں میں مصنف نے لاشعور کی رو کو بنیادی تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے اور پھر اس سے مختلف قسم کی (VARIATIONS) پیدا کی ہیں۔

بیان کے دوران میں وہ حقیقت اور فینتسی کے امتزاج سے معانی اور رنگ کی مختلف سطحیں پیش کرتا ہے اور یہاں وہ کسی حد تک کافکا کی تکنیک سے متاثر ہے۔ لیکن اس میں بھی مصنف نے انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً ''سب سے پرانی کہانی'' میں افسانے کا ڈھانچہ کافی حد تک حقیقی ہے۔ لیکن اس کے آخری جملے سے سارے افسانے کی ماہیت بدل جاتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فینتسی ہے۔ ایک شخص جو وادی میں سیر کرنے آیا ہوتا ہے، گدھے اور لاش کو دیکھ کر اس کے ذہن کا تلازمہ مختلف جہتوں میں سفر کرنے لگتا ہے۔

''پچوراہے'' کی ایک خصوصیت اس کی جذباتی شدت اور اس سے پیدا شدہ امیجز کا استعمال ہے۔ اس کے امیجز انوکھے اور حیرت انگیز حد تک سچے ہیں۔ کبھی تو وہ چھوٹے چھوٹے امیجز سے ایک بڑا امیج تیار کرتا ہے۔ اور کبھی ایک بڑے امیج سے چھوٹے چھوٹے امیجز بناتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں ''مرگی'' اور ''ٹیکر'' ہیں۔ اکثر جگہوں پر اس نے مرکب تکنیک کو بھی استعمال کیا ہے، یعنی وہ چلتے چلتے مختلف دیومالاؤں کے واقعات کو ذریعہ بیان واقعہ سے متعلق کرتا ہے، حقیقت اور فینتسی کو باری باری استعمال کرتا ہے اور ان تمام کو (SURREALISTIC) طریقے سے ایک جگہ

مرتب کرتا ہے — چور ناہے ہیں اگر مصنف کی جذباتی شدت جا بجا نظر آتی ہے تو اس نے فکری عنصر سے اس شدت کو متوازن بنایا ہے۔ وہ چلتے چلتے ایسے جملے اور لفظ استعمال کر جاتا ہے جن کی معنویت دو گونہ ہوتی ہے جو عام بیان کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے مابعد الطبیعاتی علامتوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً سب سے پرانی کہانی، میں وہ ایک جگہ پر لکھتا ہے — "یہ کون ہے؟ — کہاں سے آیا ہے؟ — وہ پہلے سے یہاں موجود ہے یا اب آیا ہے" — اس قسم کی بیشتر مثالیں چور ناہے میں موجود ہیں۔ مصنف کا پیرایہ بیان اس حد تک مثالیہ ہے کہ چور ناہے کی بیشتر کہانیاں شاعری کی حدود میں داخل ہو گئی ہیں۔

انیس ناگی

لاہور
۲۹ دسمبر ۱۹۶۲ء